ISSN 0974-7346

اگست ۲۰۲۳ء

جلد ۲۱۰—عدد ۸

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان	سالانہ ۳۵۰ءروپے۔ فی شمارہ ۳۰ءروپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴ءروپے۔ ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ءروپے میں دستیاب۔ لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰ءروپے ہے۔
دیگر ممالک	رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰ءروپے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
بذریعہ ایمیل	اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰روپے سالانہ۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:
Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۰ | ماہ محرم الحرام ۱۴۴۵ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۲۳ء | عدد ۸

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

شذرات

قریب چالیس پچاس برس پہلے تک یہ یقین ہر ہندوستانی کے لیے باعث تسکین نظر آتا تھا کہ علاقائی، لسانی، تہذیبی اور مذہبی معاملات میں آئین نے جو حقوق ہندوستانی باشندوں کے لیے متعین کیے ہیں، وہ یکساں طور پر ہر ہندوستانی کو حاصل رہیں گے، اس میں اکثریت یا اقلیت جیسی تفریق کسی طور اثر انداز نہیں ہوگی، آئین کی بالادستی بہر حال قائم رہے گی اور اس طرح قائم رہے گی کہ ہر طبقہ و فرقہ اپنے مذہبی عقائد واقدار پر عمل کرنے کا قانونی حقدار ہوگا، اور یہ حق اکثریت واقلیت کے فرق وامتیاز کے باوجود یکساں طور پر ہر باشندہ کو حاصل ہوگا۔ لیکن آئین کی اس یقین دہانی کے باوجود ملک کی مقننہ اور عدلیہ دونوں کی سرشت اور نیت و نوشت سے مسلسل یہ خواہش بھی سر اٹھاتی نظر آتی رہی کہ مختلف مذہبوں کے اپنے سماجی اصول و نظریات اور رسوم و معتقدات کی جگہ حکومت کے وضع کردہ قانون کی اتباع لازم قرار دی جائے، یعنی ہر مذہب و فرقہ کو اس کے مذہبی طور طریق سے جدا کر کے اس اکائی کا پابند کیا جائے جس کو قومی یک جہتی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بے ضرر سی خواہش تھی اس لیے اس کا ظہور دبے دبے لفظوں میں کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ لیکن جب شاہ بانو کیس کا جن بوتل سے باہر آیا تو اسی فیصلہ میں سپریم کورٹ کے اس وقت کے چیف جسٹس نے اپنے فیصلہ کے پیرا گراف نمبر ۳۲ میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ دستور کا وجود اگر با معنی ہے تو یکساں سول کوڈ کے ذریعہ قومی یک جہتی معاملہ میں مدد مل سکتی ہے، جج صاحب نے سول کوڈ کے یکساں نہ ہونے کو ناانصافی کے عام ہونے سے تعبیر کر دیا۔ کمال یہ ہے کہ یکساں کا لفظ تو عام رہا، لیکن نیت کسی خاص کی جانب اشارہ ہی نہیں صراحت کرتی نظر آئی جب اسی پیرا گراف میں جج صاحب نے یہ بھی سپرد قلم کر دیا کہ ایک یکساں سول کوڈ کی تشکیل کے لیے کسی سرکاری کوشش کا وجود نہیں ملتا ہے، بس صرف یہ یقین دہانی ملتی ہے کہ یہ مسلمانوں پر ہے کہ وہ اپنے پرسنل لا کی اصلاح کے لیے پیش قدمی کریں،.....تاکہ متضاد نظریات رکھنے والی اور قانون کی متوازی وفاداریاں ختم ہو جائیں۔ اصل معاملہ یہی تھا کہ متضاد نظریات اور متوازی وفاداریوں جیسے الفاظ اور خیالات کا سرچشمہ کہاں تھا اور کیا تھا؟ اس وقت ملک کے سامنے یہ سرچشمہ ایک آتش فشانی دہانہ کی شکل میں جانا جاتا تھا اس لیے یکساں سول کوڈ کا معاملہ بھی زیادہ توجہ بلکہ شر و فساد کا سبب نہیں بن سکا، لیکن پچاس سال بعد ملک اور خاص طور پر اس کی سب سے بڑی مذہبی اقلیت جب سیاسی بے شعوری اور عقلی بے چارگی کی وجہ سے گویا اپنی زندگی اور بربادی کے درمیان کوما کی حالت میں پہنچ گئی تو پھر زہر کو دوا کے نام پر دیے جانے اور رقص بسمل کا تماشا دکھانے کی جیسے ہوڑ سی لگ گئی، قومی یک

جہتی کے معانی سے بے نیاز قوم پرستی کے کھوکھلے لفظ نے جو شور برپا کیا، اس کا شمار اور اس کا حساب لگانے کی ذمہ داری تو صحیح معنوں میں آنے والے وقت کے مورخوں کی ہے۔ لیکن موجودہ وقت تو اس خاص اقلیت کے لیے محض عجب وقت کی دہائی دینے اور اسے وقف، وقت دعا کرنے کا ہے جو جھوٹ، مکر، فریب، زور اور سازش جیسے شیطانی اسلحوں کی مسلسل یلغار سے نیم جاں ہوتی جاتی ہے، اکیسویں صدی میں کوئی شبلی بھی نہیں جو باطل کی تلواروں کی تیزی کو آزمانے کی تیاری دیکھ کر سہما سا سوال اس طرح کر دے کہ پوری قوم کو جواب میں نئی زندگی اور نئی توانائی کا سراغ مل جائے کہ:

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے		ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
یہ مانا گرمی محفل کے ساماں چاہئیں تم کو		دکھائیں ہم تمہیں ہنگامہ آہ و فغاں کب تک

اس ہنگامہ آہ و فغاں میں یکساں سول کوڈ تو صرف ایک نالۂ درد ہے، آنے والے برس کی گرمی محفل کے لیے ہر روز، نیا ہنگامہ بپا ہونے کا پیغام لاتا ہے، اتراکھنڈ اور اجین کی اقلیتی بستیوں کا اجاڑنا اور اجڑے ہوئے روہنگیائی مسلمانوں کی خانہ خرابی کی آگ کو ہوا دینا، قدیم ترین اور قانوناً جائز زمینوں پر ایستادہ مسجدوں کو چند گھنٹوں کے مکر و فریب کی بنیادوں پر ڈھا دینا اور بنیادی مذہبی شناخت سے ملت کو محروم کر دینا، یہ سب کیا ہے؟ اس کو محض ہنگامہ آہ و فغاں کی مجلس بپا کرنے کی کوشش کہہ کر خاموش نہیں رہا جا سکتا، اس کے لیے صدا و صوت کے للکار میں بننے اور بدلنے کے لیے میدان میں شعور و تدبر کے میمنہ و میسرہ کا ہوشیار اور کمربستہ و تیار ہونا ضروری ہے۔

***

اس ضرورت کے لیے بظاہر ایک لشکر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی شکل میں بعض دردمند اور فکرمند ساتھ ہی ہوش مند ذہنوں کی عملی کاوشوں کا مظہر ہے، یکساں سول کوڈ کے لیے ملک و ملت اور حکومت و عوام کی صحیح رہنمائی کا فریضہ اس کا حق ہے اور کسی نہ کسی درجہ میں بورڈ اس حق کو ادا کر بھی رہا ہے، اصل معاملہ یہ ہے کہ دوسرا فریق مخالف ہونے بلکہ دشمن ہونے کے باوجود اگرچند بنیادی انسانی اخلاق و قوانین سے باخبر ہو، اور کچھ شریفانہ روایات سے واقف اور ان کی اہمیت کا معترف ہو تو گفت و شنید جیسے الفاظ کے معانی ظاہر ہونے کی امید رہتی ہے۔ لیکن معاملہ اگر اس کے برعکس ہو یعنی دوسری جانب صرف تکبر، جھوٹ، فریب اور دوسرے کو مجبور اور کمزور سمجھ کر اپنی طاقت کے زعم میں مبتلا ہونے کا خبط ہر نیت اور عمل میں کارفرما ہو اور جس کو روایتوں کے تحفظ و تقدس کی پرواہی نہ ہو اس سے کسی وفا کی امید واقعی نہیں کی جا سکتی، جو انسانیت کا مدعا ہی نہ سمجھے تو ایسے کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بس خدا ہی سمجھے۔

***

یکساں سول کوڈ کا شورا بھی تھما بھی نہیں تھا کہ شمال مشرق کی ایک چھوٹی سی ریاست منی پور میں نفرت کے شعلے کچھ اس طرح بلند ہوئے کہ ہر شخص منی پور کی آگ سے جیسے جھلس گیا، دیکھتے دیکھتے ساتھ رہنے والے کس طرح ایک دوسرے کی عزت آبرو اور جان مال کے درپے ہو گئے، اور ترقی اور تہذیب جدید کے ثناخوانوں کے چہرے کلنک اور کالک سے بھیانک بن گئے، اس کا تصور بھی شاید چند مہینوں پہلے محال تھا، گجرات میں ملک کی بڑی اقلیت اور منی پور میں ملک کی چھوٹی سی اقلیت کے ساتھ یہ یکساں طرز عمل نئی قومی یکجہتی کے حروف تہجی کو ذرا غور سے دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

***

مولانا پروفیسر ابو محفوظ الکریم معصومی، ہمارے ان ہندوستانی علما میں تھے جو ابھی اکیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان کے علوم اسلامیہ و شرقیہ میں بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے، عالمانہ مقالات، تلاش مخطوطات، تحقیقی مضامین اور عربی، فارسی، اردو کے علاوہ دوسری کئی اور زبانوں میں غضب کی دسترس رکھنے والے تھے، ان کی شخصیت پر جامعات میں کئی تحقیقی مقالے لکھے گئے، معارف سے ان کا رشتہ تو ہونا ہی تھا، جو پچاس سال جاری رہا، وہ معارف کی مجلس ادارت اور دارالمصنّفین کی مجلس انتظامیہ کے معزز رکن بھی تھے۔ ۱۵/ جولائی کو مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے ان کی علمی خدمات کی یاد میں ایک محفل آراستہ کی، مولانا ڈاکٹر ابو سحبان روح القدس ندوی کے کلیدی خطبہ کے علاوہ جناب کلیم حاذق، ڈاکٹر نصرت جہاں، ڈاکٹر سید عبدالرشید، جناب نسیم عزیزی وغیرہ نامور اہل علم کے علاوہ ڈاکٹر انیس الرحمن، جناب منظر حسین، ڈاکٹر صدر الاسلام، ڈاکٹر ابوالکلام جیسے نوجوان محققین نے بھی بہترین نتائج مطالعہ پیش کیے۔ مولانا معصومی کے داماد جناب شاہد عالم کی شرکت نے مولانا کی گھریلو زندگی کی بڑی پر اثر یادیں تازہ کر دیں۔ اکیڈمی کی فنکشن سب کمیٹی کے چیرمین جناب سید شہاب الدین حیدر کی سرپرستی اور نہایت فعال و متحرک اور چاق و چوبند رہنے والے ڈاکٹر دبیر احمد کی بہترین تنظیمی صلاحیتوں کی وجہ سے یہ یک روزہ سیمینار واقعی یادگار بن گیا اور یہ احساس بھی دلا گیا کہ غالب کا کلکتہ ابھی زندہ ہے۔

***

مقالات

سیرت عمر فاروقؓ: علامہ شبلی اور دیگر مصنفین کا تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر محمد اسامہ

گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

musama1@jmi.ac.in

ڈاکٹر نجم السحر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

nsahar@jamiahamdard.ac.in

حضرت عمر فاروقؓ کی پر کشش شخصیت اور لازوال کارنامے اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔ انہوں نے اپنے دس سالہ دور خلافت میں انفرادی واجتماعی سطح پر زہد و تقویٰ، خشیت الٰہی، دین کی دعوت و تبلیغ، اسلامی ریاست کا انتظام و انصرام، جہاد فی سبیل اللہ، عام و خاص کے حقوق کی پاس داری، عمال کی نگرانی، نیز ان سے یکساں حساب دہی اور غیر معمولی عدل و انصاف میں ایسی خدمات انجام دی ہیں جن کی دنیا آج تک مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم و دانش جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں، نے ان کے احوال و کوائف، فضائل و مناقب اور خدمات کو مختلف زبانوں میں قلم بند کرنے کی کوششیں کی ہیں، البتہ بعض نے اس موضوع پر مکمل کتاب/ کتابچہ لکھا ہے اور بعض نے ان کی زندگی کے کسی گوشہ یا خلفائے راشدین کے تحت مختصراً موضوع بحث بنایا ہے۔ آخر الذکر طبقہ میں مصنفین اور مرتبین دونوں شامل ہیں۔

اول طبقہ میں منشی سراج الدین[1] (سیرۃ الفاروق)، علامہ شبلی نعمانی (الفاروق)، حکیم محمد عبدالوحید

[1] منشی سراج الدین (۱۸۶۷۔۱۹۲۵ء) پیشہ سے وکیل تھے اور راولپنڈی میں وکالت کرتے تھے۔ نیز انہیں ادب اور صحافت سے خصوصی دل چسپی تھی، ''سرمور گزٹ'' اور ہفت روزہ ''چودھویں صدی'' اسی شوق کی دین ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں حیات صلاح الدین، تعلیم، حقیقت خلافت اور مسلمان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ وہ

فاروقی[۲] (شوکت فاروقی)، محمد حسام الدین فاضل قادری[۳] (تذکرہ عمرؓ)، آغا رفیق بلند شہری[۴] (حضرت عمر

سر سید احمد خاں کے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے جب علامہ شبلی نعمانی کی جانب سے الفاروق لکھے جانے کا تذکرہ اور عوام الناس کی اس کے لیے بے صبری دیکھی تو جلد بازی میں ''سیرۃ الفاروق'' لکھ ڈالی، اسے اردو زبان میں حضرت عمر فاروق کی اولین سوانح عمری سمجھا جاتا ہے۔ ان کی اس غیر اخلاقی حرکت پر سر سید نے بھی ناگواری ظاہر کی تھی۔ کتاب کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں انہیں بھی اس غلطی کا اعتراف ہے، اسی لیے انہوں نے اپنے مقدمہ کے اخیر میں علامہ شبلی کی الفاروق کے حوالے سے تعریفی کلمات کہہ کر اپنے اخلاقی جرم کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو: منشی سراج الدین، سیرۃ الفاروق، بلالی پریس، ساڈھور، ضلع انبالہ، ۱۸۹۵، دفعہ دوم، صفحات ۳۰-۳۱۔ ان کی یہ کتاب ۳۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ انداز تحریر عالمانہ اور محققانہ نہیں ہے اور نہ ہی بنیادی ماخذ و مصادر کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ عبارتیں اور واقعات بھی کافی مشکل اور بے ترتیب ہیں۔

[۲] حکیم محمد عبدالوحید فاروقی کے حوالے سے باوجود تلاش و بسیار کے کچھ نہیں مل سکا، البتہ ان کا کتابچہ 'شوکت فاروقی' تقریباً پچاس (۵۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے بخشی پریس، کان پور نے ۱۹۰۱ میں شائع کیا تھا۔ اس میں انہوں نے حضرت عمرؓ فاروق کی مختصر سوانح حیات، اہم واقعات، فتوحات، نظم و نسق اور سماجی و معاشی حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں مصادر و مراجع کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

[۳] حضرت الحاج علامہ محمد حسام الدین فاضل قادری کا تعلق حیدر آباد سے تھا۔ وہ ایک بہترین ادیب، شاعر، واعظ اور تاریخ نویس تھے۔ ان کا تخلص فاضل تھا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر ضخیم کتابوں کے بجائے زیادہ تر کتابچے لکھے ہیں۔ ان میں دلائل ختم نبوت، سعادت دارین، تذکرہ ابو بکرؓ، تذکرہ عثمانؓ، تذکرہ علیؓ، تذکرہ حسنؓ، تذکرہ حسینؓ، تذکرہ نماز، جواہر مناقب (سید عبدالقادر جیلانی)، جذبات فاضل اور مناجات فاضل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ہی کا ایک کتابچہ ''تذکرہ عمر'' ہے جو ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے، اسے اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر، چار مینار، حیدر آباد دکن نے ۱۳۵۴ ہجری میں شائع کیا تھا۔ اس میں انہوں نے حضرت عمرؓ فاروق کے نام، نسب، ولادت، اسلام اور فاروق کا لقب، ہجرت، فضائل، موافقات عمر، کرامات، ہجرت سے آنحضرت صلعم کی وفات تک، بارگاہ نبوت میں رسوخ، اشاعت اسلام، فتوحات، فتوحات فاروقی کی خصوصیات، نظام خلافت، خلیفہ کی تنخواہ، اخلاق و عادات، عبادت و خوف خدا، محبت و احترام رسول، علم و فضل، زہد و تقویٰ، جود و سخا، تشدد و رحم، خدمت خلق، عدل و انصاف، مساوات، عام آزادی، قحط کا انتظام، تواضع و سادگی، جفاکشی، نفس کشی، رعب و جلال، حلیہ اور شہادت کے تحت گفتگو کی ہے۔

[۴] مولانا آغا رفیق بلند شہری کو تصنیف و تالیف اور تراجم سے خصوصی شغف تھا۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں مذہب، اسلامی تاریخ اور اس کی اہم شخصیات کو خصوصی جگہ دی، اسی لیے ان کے قلم سے آفتاب

فاروقؓ)، محمد حسین ہیکل[۵] (الفاروق عمرؓ)، ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی[۶] (أمیر المؤمنین عمر بن الخطابؓ شخصیتہ وعصرہ)، عمر التلمسانی (شہید المحراب عمر بن الخطاب)، عباس محمود عقاد (عبقریۃ عمر)، عبدالرحمن شرقاوی (الفاروق عمر) کے نام قابل ذکر ہیں۔

دوسرے طبقے کی ایک لمبی فہرست ہے جس میں پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی (تاریخ تہذیب اسلامی، جلد دوم)، شاہ معین الدین احمد ندوی (تاریخ اسلام، جلد اول)، مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی (تاریخ اسلام، جلد اول)، الدکتور طہ حسین "الشیخان" (دو خلفائے رسول: حضرت ابو بکر صدیق و حضرت عمرؓ فاروق)، مولانا عبدالمالک مجاہد (سیدنا عمر فاروقؓ کی زندگی کے سنہرے واقعات)، مولانا لیاقت علی شاہ نقش بندی (موافقات سیدنا عمرؓ)، ندیم صہبائی فیروز پوری (حضرت عمرؓ کا انصاف)، خورشید احمد فارق (حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۹۵۹) اور مجیب الرحمن شامی، مرتب (فاروق اعظم نمبر،

رسالت، چاروں خلیفہ کے سوانح حیات اور کارنامے، عذراء قریش، حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ، نور جہاں، انقلاب سیاسی اور انقلاب کابل جیسی اہم کتابیں نکلیں۔ انہوں نے عربی کی بعض اہم کتابوں کا ترجمہ بھی کیا جس میں انقلاب عثمانی، حجاج بن یوسف، شارل و عبدالرحمن (جرجی زیدان کے مشہور تاریخی ناول ہیں)، لیلائے کربلا اور سیرۃ ام المؤمنین سیدہ خدیجہ الکبریٰ (امام زہراوی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ہی کی ایک کتاب "حضرت عمر فاروقؓ" ہے جو ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے نو بہار بک ڈپو، کوچہ دکھنی دہلی نے شائع کیا تھا۔

[۵] محمد حسین ہیکل (۱۸۸۸-۱۹۵۶) کا تعلق مصر سے تھا۔ وہ ایک مشہور ادیب، صحافی، سیاست داں اور مؤرخ تھے۔ انہیں ایک بار منسٹر آف اسٹیٹ اور متعدد مرتبہ وزیر تعلیم بنایا گیا۔ موصوف نے تاریخ اسلامی، فلسفہ، عربی ادب اور بعض دیگر موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں حیاۃ محمد، الصدیق ابو بکر، الفاروق عمر، عثمان بن عفان، زینب، شرق و غرب، الامبراطوریۃ الاسلامیۃ والاماکن المقدسۃ وغیرہ مشہور ہوئیں۔

[۶] ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی (۱۹۶۳) کا تعلق بنغازی، لیبیا سے ہے۔ وہ ایک مشہور عالم دین، فقیہ اور مؤرخ ہیں۔ انہوں نے سیرۃ نبوی، اسلامی تاریخ، سوانح حیات اور اسلامی عقائد وارکان وغیرہ پر پینتیس (۳۵) سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی اہم کتابوں میں الانشراح ورفع الضیق بسیرۃ ابی بکر، فصل الخطاب فی سیرۃ أمیر المومنین عمر بن الخطاب، تیسیر الکریم المنان فی سیرۃ عثمان بن عفان، اسمی المطالب فی سیرۃ امیر المؤمنین علی بن ابی طالب، فاتح القسطنطینیۃ السلطان محمد فاتح، الدولۃ العثمانیۃ عوامل النھوض واسباب وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۸۳)وغیرھم کا نام لیا جا سکتا ہے۔ذیل میں صرف تین اہم کتابوں الفاروق،الفاروق عمراور امیر المومنین عمر بن خطاب شخصیتہ وعصرہ کا تفصیلی تعارف تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔

(۱)الفاروق: علامہ شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق تصنیف ''الفاروق''،تقریباً تین سو بیاسی(۳۸۲)صفحات پر مشتمل ہے۔اگرچہ یہ کتاب ۱۸۹۸میں مکمل ہوئی[۷]،لیکن اس کا تذکرہ صاحبِ کتاب نے 'المامون'(۱۸۸۷)کے دیباچہ میں پہلے ہی کردیا تھا۔دراصل انہوں نے 'رائل ہیروز آف

---

[۷] علامہ شبلی نعمانی نے ۱۸/اگست ۱۸۹۴کو باقاعدہ اس کتاب کو لکھنے کا آغاز کیا اور مسلسل چار سال کی محنت ومشقت کے بعد اسے ۱۸۹۸میں پورا کیا،لیکن انہوں نے اس کی شروعات 'المامون' کے بعد ہی کردی تھی اور کئی حصوں کو لکھ بھی لیا تھا۔علامہ موصوف نے اس کا تذکرہ ''سیرت النعمان''(جنوری/۱۸۹۲) کے دیباچے میں کیا ہے۔اس کی تائید ان کے ۲۳/جون ۱۸۹۷کو لکھے گئے ایک خط سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے مسٹر محمد اسحٰق صاحب،بی اے ایل ایل بی کو لکھا:''میں الفاروق کے چند اجزاء کان پور مطبع نامی میں چھپنے کے لیے دے آیا......''(ندوی،سید سلیمان، مکاتیب شبلی، مطبع شاہی، لکھنؤ،سن اشاعت غیر مذکورہ، حصہ اول، ص۳۳)اسی طرح وہ مولانا حمید الدین صاحب،بی اے،جو ان کے ماموں زاد بھائی اور لائق و فائق شاگرد بھی تھے،کو ۱۱/جولائی ۱۸۹۷کے ایک خط میں مخاطب کرکے لکھتے ہیں:''میں نے الفاروق مطبع نامی کان پور میں چھپنے کو دے دی،لیکن ابھی اصل کتاب میں ایک ثلث تصنیف کے لیے باقی ہے۔'' مکاتیب شبلی، مطبع معارف،اعظم گڑھ، طبع اول،۱۹۱۷، حصہ دوم، ص۰۲۔ان ہی کو علامہ شبلی ۰۴/فروری ۱۸۹۸کو اگلے خط میں اطلاع دیتے ہیں:''الفاروق حصہ دوم بہمہ وجہ میں نے تیار کرلیا ہے،قریباً نصف حصہ چھپ بھی گیا ہے۔'' مکاتیب شبلی، حصہ دوم، ص ۰۴۔ایس ایم اکرام نے ان ہی دلائل کی بنیاد پر الفاروق کو علی گڑھ کے دور کی تصنیف قرار دیا ہے،جب کہ بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کتاب علی گڑھ کے بعد کے زمانے کی ہے اور یہی خیال ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی کتاب ''سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء''میں ظاہر کیا ہے۔ملاحظہ ہو:ایس ایم اکرام،یادگار شبلی،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور،طبع دوم،۱۹۹۴،صفحات ۲۰۴-۲۰۵)۔اس کتاب کی تدوین کے متعلق محمد یحییٰ تنہا نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی ۱۸۹۹میں کشمیر جب گئے تو یہ اس وقت زیر ترتیب تھی،اسی دوران ان کی طبیعت خراب ہوئی اور جس روز الفاروق کی آخری سطور انہوں نے لکھی،وہ بستر مرض پر دراز تھے اور گھنٹوں بے ہوش رہے،البتہ قیام کشمیر کے زمانہ میں ہی یہ کتاب چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ملاحظہ ہو: تنہا، محمد یحییٰ، سیر المصنفین، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ،دہلی،۱۹۲۸،جلد دوم، صفحات ۴۱۵-۴۱۶۔البتہ اس سلسلہ میں ایس ایم اکرام کی رائے زیادہ درست ہے کیوں کہ کتاب کے خاتمہ میں ۵جولائی ۱۸۹۸ہی درج ہے اور مقام بھی کشمیر ہے۔

اسلام[8] (نامور فرمانروایان اسلام) کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا اور اس میں پہلے نمبر پر خلفائے راشدین میں سے حضرت عمر فاروقؓ کو منتخب کیا تھا، لیکن بعض وجوہ کی بنا پر انہوں نے اس سلسلے کی ابتداء ''المامون'' سے کی، اس سے متعلق وہ خود افسوس ظاہر کرتے ہیں:

> اس بات کا مجھ کو بھی افسوس ہے کہ چند مجبوریوں کی وجہ سے اس سلسلہ میں ترتیب کی پابندی نہ کر سکا اور خلفائے راشدین و بنو امیہ کو چھوڑ کر پہلے اس خاندان کو لیا جو ترتیباً تیسرے نمبر پر تھا، آئندہ بھی میں شاید ترتیب کی پابندی نہ کر سکوں۔[9]

الفاروق دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں تمہیدی گفتگو کے علاوہ حضرت عمرؓ کی ولادت سے وفات تک کے واقعات اور ملکی فتوحات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، جب کہ دوسرے حصے میں ان کے ملکی، سیاسی، مذہبی اور معاشی انتظامات کے علاوہ فاروق اعظم کے علمی کمالات، نیز ان کے اخلاق و عادات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ دوسرا حصہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے اور بقول شبلیؒ یہ مصنف کی سعی و محنت کا ''تماشاگاہ'' ہے۔ یہ کتاب سلسلہ آصفیہ[10] کی فہرست میں بھی شامل ہے۔ اس کی اشاعت پہلی

---

[8] علامہ شبلی اسلامی حکومت کی ایک مفصل اور مبسوط تاریخ لکھنا چاہتے تھے، لیکن یہ کام خاصا وقت و دقت طلب تھا۔ اس لیے انہوں نے صرف خلافت یا سلطنت کے ان نامور افراد کو منتخب کیا جو اپنے طبقے میں دیگر تمام افراد پر فوقیت رکھتے تھے۔ اس میں خلفائے راشدین میں حضرت عمر فاروقؓ، بنو امیہ سے ولید بن عبدالملک، عباسیہ سے مامون رشید، بنو امیہ اندلس سے عبدالرحمن ناصر، بنو حمدان سے سیف الدولہ، سلجوقیہ سے ملک شاہ، نوریہ سے نورالدین محمود زنگی، ایوبیہ سے سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس، موحدین اندلس سے یعقوب بن یوسف اور ترکان روم سے سلیمان اعظم کو ترجیح دی تھی۔ ملاحظہ ہو: شبلی نعمانی، المامون، افضل المطابع پریس، دہلی، سن اشاعت غیر مذکورہ، صفحات ۴-۵۔ محمد یحییٰ تنہا نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی کو پہلے ''تاریخ بلاد اسلامیہ'' لکھنے کا خیال آیا، پھر اس خیال کو گھٹا کر ''تاریخ بنی العباس'' شروع کی، لیکن جس قدر آگے بڑھتے گئے، میدان زیادہ کشادہ، فراخ اور نتیجہ صبر آزما اور دیر طلب نظر آنے لگا۔ ناچار 'نام وران اسلام' کی منزل پر مسافر خیال نے دم لیا اور المامون شروع ہو کر ختم ہوئی۔ سیر المصنفین، جلد دوم، ص ۴۱۴

[9] المامون، صفحہ ۵

[10] مولانا سید علی بلگرامی نے نواب محمد فضل الدین خاں سے درخواست کی تھی کہ نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ سلطان دکن کی سرپرستی میں علمی تراجم و تصنیفات کا ایک سلسلہ قائم کیا جائے جو سلسلہ آصفیہ کے نام سے معروف ہو اور وابستگان دولت آصفیہ کی جو تصانیف قابل قبول ہوں، وہ اس میں شامل کی جائیں۔ علامہ شبلی کو دولت آصفیہ سے ۱۸۹۶ میں ملی ہوئی عطیہ ماہوار کی سند میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ

بار جنوری ۱۸۹۹ میں مطبع نامی، کان پور سے ہوئی تھی، اس کے بعد تقریباً چوالیس (۴۴) سے زائد پبلیشرز اور پریس کو اسے شائع کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ علمی میدان میں الفاروق کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا دنیا کی مختلف زبانوں جیسے انگریزی، ترکی، پشتو، ملیالم، کنڑ اور فارسی وغیرہ میں تلخیص اور ترجمہ کیا جاچکا ہے، نیز مختلف علماء کرام اور محققین نے اس کتاب پر تحسین و تعریف کے علاوہ نقد و تنقید بھی کی ہے۔[۱۱]

الفاروق کی تصنیف پر اختلاف: یہ بہت دل چسپ بات ہے کہ ایک ایسی کتاب جس کی اہمیت وافادیت تقریباً ایک سو بائیس (۱۲۲) سال گزر جانے پر بھی کم نہیں ہوئی ہے اور آج بھی جسے حضرت عمر فاروقؓ کی حیات و خدمات کے حوالے سے مرجع و منبع کی حیثیت حاصل ہے، کی تصنیف پر علامہ شبلی اور سر سید احمد خان، نیز بعض دیگر افراد کے درمیان کثرت سے اختلاف ہوا کہ آیا اسے لکھا جائے یا چھوڑ دیا جائے؟ اس کے مختلف اسباب بیان کیے جاتے ہیں، جیسے شیعہ سنی کے درمیان اختلافات پیدا ہونے کا ڈر، سر سید کو نواب عماد الملک سید حسن بلگرامی کی ناراضگی کا خوف، سر سید کا ''بزرگانِ دین'' کو ''ہیروز آف اسلام'' کے بجائے ''فادر آف اسلام'' سمجھنا، منشی سراج الدین کا جلد بازی میں ''سیرۃ الفاروق'' لکھ

ان کی تمام آئندہ کتب اس فہرست میں شامل سمجھی جائے گی۔ علامہ شبلی نے اس کا اعتراف اپنے دیباچہ میں کیا ہے۔

[۱۱] تحسین و تنقید میں مرزا عابد علی بیگ قزلباش کی ضخیم کتاب ''الفرق''، جو ''الفاروق'' پر بطور تبصرہ لکھی گئی تھی، جیسا کہ خود اس کتاب کے سرورق پر لکھا ہے: ''شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی کی مشہور کتاب ''الفاروق'' پر عالی جناب مرزا عابد علی بیگ صاحب قزلباش کا محققانہ ریویو''۔ اس کا پورا نام ''فالفارقات فرقا الفرق'' ہے، البتہ بعض نے اس کا نام ''النظر السموق فی سیرۃ الفاروق'' لکھا ہے۔ اسے مولوی سید محمد صاحب رضوی عرف بنے میاں نے پہلی بار ۱۹۰۷ میں برلاس پریس، مراد آباد سے شائع کرایا۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد ۲۹۶ صفحات کی ہے اور دوسری جلد ۲۷۶ صفحات کا احاطہ کرتی ہے، نیز سر سید احمد خان کا تحریر کردہ مضمون ''پروفیسر مولوی شبلی نعمانی'' (اصغر عباس، انتخاب مضامین، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲، ص ۹۷)، ایم مہدی حسن مرحوم کا مضمون ''تمدن عرب اور پروفیسر شبلی (مہدی بیگم، افادات مہدی، مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۳۹، طبع سوم، ص ۱۴)، محمد حبیب الرحمن خاں شروانی کا تبصرہ ''الفاروق'' (شروانی، محمد مقتدیٰ خاں، مقالات شروانی، شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ، سن اشاعت غیر مذکورہ، ص ۳۳) اور مولانا حافظ محمد جان غازی پوری کا طویل مضمون ''تنقید الفاروق'' (ماہ نامہ، الناظر، لکھنؤ، ستمبر - اکتوبر ۱۹۱۹) خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

دینا اور تاریخ طبری کا مکمل طور سے شائع نہ ہونا۔ ان تمام گوشوں کا سید سلیمان ندویؒ نے ''حیات شبلی'' میں تفصیلی جائزہ لیا ہے۔[۱۲] تاہم علامہ شبلی نعمانی نے صرف نادر کتابوں کی عدم دستیابی اس کی وجہ بتائی ہے، جیسا کہ سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا، لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لیے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا، اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں، حالاں کہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لیے نہایت ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں، ابھی تک پوری چھپ کر آ نہیں چکیں۔ اس زمانہ انتظار میں بیکار بیٹھنا تو مشکل تھا، خیال ہوا کہ کسی اور نام ور کی لائف شروع کر دوں لیکن یہ دیکھ کر کہ الفاروق ناتمام ہے، طبیعت رک جاتی تھی اور اس میدان میں قدم آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔[۱۳]

(۲) الفاروق عمرؓ: چھ سو چوبیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب محمد حسین ھیکل کی ہے، جس کا جدید ایڈیشن مؤسسۃ ھنداوی للتعلیم والثقافۃ، القاھرۃ نے ۲۰۱۴ میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۴ میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ حبیب اشعر نے 'حضرت عمر فاروق اعظم' کے نام سے کیا ہے۔ اسے اسلامک بک فاؤنڈیشن، حوض سوئی والان، نئی دہلی نے طبع کیا ہے۔ محمد حسین ہیکل کی یہ کتاب ایک طویل مقدمہ (۱۹ صفحات)، پچیس عناوین، خاتمہ اور عربی و دیگر زبانوں میں موجود مصادر و مراجع پر مشتمل ہے۔ اس کے اہم مشمولات میں عمر فی الجاھلیۃ، اسلام عمر، فی صحبۃ النبی، فی عھد ابی بکر، عمر یستفتح عھدہ، القادسیۃ، المسلون فی العراق، عمر فی بیت المقدس، مصیر خالد بعد اخضاع الشام، فتح مدینۃ مصر وحصونھا، فتح الاسکندریۃ، حکومۃ عمر، الحیاۃ الاجتماعیۃ فی عھد عمر، اجتھاد عمر قابل ذکر ہیں۔

(۳) امیر المومنین عمر بن خطاب شخصیتہ وعصرہ: سات سو تین صفحات پر مشتمل یہ کتاب ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی کی ہے، جسے مکتبۃ التابعین، القاھرۃ نے پہلی بار ۲۰۰۲ء میں شائع کیا تھا۔ انہوں نے یہ کتاب

---

[۱۲] ملاحظہ ہو: ندوی، سید سلیمان، حیات شبلی، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۸، صفحات ۱۹۹-۲۰۴۔ اصغر عباس نے بھی اس سلسلے میں سر سیدؒ کی تحریر کو اپنی مرتب کردہ کتاب میں جگہ دی ہے۔ ملاحظہ ہو: انتخاب مضامین، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، صفحات ۷۹-۸۱۔ ایس ایم اکرام نے اپنی کتاب 'یادگارِ شبلی' میں اس پر خصوصی بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو: یادگار شبلی، صفحات ۲۰۴-۲۱۶

[۱۳] نعمانی، علامہ شبلی، سیرۃ النعمان، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۲، صفحات ۴-۵

۲۸ نومبر ۲۰۰۱ء میں مکمل کی تھی۔اس کا اردو ترجمہ شمیم احمد خلیل السلفی اور عبدالمعین بن عبدالوہاب مدنی نے ''سیدنا عمر بن خطاب شخصیت اور کارنامے'' کے عنوان سے کیا ہے جو الفرقان ٹرسٹ، خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ، پاکستان سے شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی کی یہ کتاب آٹھ صفحات کے مقدمہ کے علاوہ سات فصول یا ابواب، مراجع و مصادر اور فہرست پر مشتمل ہے۔اس میں انہوں نے حضرت عمرؓ کی مکی زندگی، ان کی قرآنی اور نبوی تربیت، خلافت کے لیے نامزدگی، نظام حکومت کے اصول اور معاشرتی زندگی، وزارت خزانہ و وزارت عدل اور عہد فاروقی میں ان کی ترقی، ریاست کے گورنروں کے ساتھ فاروقی طرز عمل، عہد فاروقی میں عراق و مشرق کی فتوحات اور فتوحات شام، مصر اور لیبیا وغیرہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے، نیز بعض جگہوں پر صاحب کتاب نے ''اہم دروس و عبر و فوائد'' کے تحت موضوع سے متعلق ذاتی تبصرے کیے ہیں اور قارئین کو وعظ و نصیحت بھی کی ہے۔

تقابلی مطالعہ: راقم الحروف نے اس مقالے میں حضرت عمر فاروقؓ سے متعلق علامہ شبلی نعمانی، محمد حسین ہیکل اور علی محمد محمد الصلابی کی کتابوں کے درمیان تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ان میں سے اول الذکر اردو میں ہے اور باقی دونوں تصانیف عربی زبان میں لکھی گئی ہیں، البتہ استفادہ اردو ترجموں کے ساتھ ساتھ اصل عربی نسخوں سے بھی کیا گیا ہے تقابلی مطالعہ کے دوران معلوم ہوا کہ ترجمہ میں متعدد جگہوں پر غلطیاں ہیں، نیز بعض عربی عبارتوں کا ترجمہ بھی نہیں کیا گیا ہے۔یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ تقابلی مطالعہ کی بنیاد منہج تحقیق (جس میں تاریخ نگاری کے بنیادی اصول، روایت و درایت اور مصادر و مآخذ وغیرہ شامل ہیں) کے علاوہ بعض ایسے اہم واقعات پر ہے جن کے متعلق سے مؤرخین و محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے، راقم الحروف نے اس ضمن میں اپنی رائے بھی تحریر کی ہے۔

منہج تحقیق: علامہ شبلی نعمانی نے ''الفاروق'' کا آغاز ''تمہید'' سے کیا ہے، اس میں انہوں نے بنیادی طور پر کتاب کے منہج تحقیق کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ تاریخ کسے کہتے ہیں؟ اس کے لیے کیا چیزیں ضروری ہیں؟ قدیم تاریخ کے نقائص اور اسباب کیا تھے؟ واقعات کی صحت کا معیار کیا ہے؟ ان حوالے سے روایت و درایت کا کیا کردار ہے؟ اصولِ درایت سے کن امور اور حقائق کا پتہ لگایا جاسکتا ہے؟ تاریخ کا طرز تحریر کیا ہونا چاہیے، نیز اس میں اور انشاء پردازی میں فرق کیا ہے؟ ایک مؤرخ کے کیا بنیادی فرائض ہیں اور اہل یورپ بالخصوص مستشرقین نے اس سلسلے میں کس قسم کی بے اعتدالیاں کی ہیں؟ اس کے علاوہ شبلی نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ سیرت نبوی کی سب سے پہلی تصنیف کون سی ہے؟

مشہور قدیم مؤرخین اور ان کی تصانیف کون سی ہیں؟ان میں سے کون سی تصانیف آج موجود ہیں؟متاخرین میں کون کون مؤرخین ہیں؟ان کی خصوصیات کیا تھیں؟

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی 'تمہید' میں تاریخ کے بنیادی اور لازمی اصولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس عہد کا حال لکھا جائے،اس میں اس زمانے کے تمام واقعات قلم بند کیے جائیں،یعنی اس دور کا تمدن،معاشرت،اخلاق وعادات،مذہب الغرض ہر چیز کا احاطہ کیا جائے اور اسی طرح تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ بھی تلاش کیا جائے،نیز ان واقعات کی صحت کے معیار کو دو طریقوں سے پرکھا جائے۔اول روایت یعنی جو واقعہ بیان کیا جائے،اسے اس شخص کے ذریعے بیان کیا جائے جو خود اس واقعہ میں موجود تھا اور اس سے لے کر آخری راوی تک روایت کا سلسلہ متصل بیان کیا جائے۔دوم درایت یعنی اصول عقلی سے واقعہ کی صحت کو پرکھا جائے۔الفاروق کے مطالعہ کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ موصوف نے ان اصولوں کا خصوصی خیال رکھا ہے۔جہاں تک مصادر وماخذ کی بات ہے تو اس پہلو پر بھی انہوں نے بھرپور توجہ دی تھی اور حضرت عمرؓ فاروق سے متعلق عربی ودیگر زبانوں میں موجود بنیادی اور مستند کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر،ترکی اور شام کے کتب خانے بھی چھان مارے تھے،سفر نامہ روم ومصر وشام میں لکھتے ہیں:

> جس زمانہ میں مجھ کو ہیروز آف اسلام کا خیال پیدا ہوا۔اسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے،وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا،یہی خیال تھا جس نے اول اول اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی،کیوں کہ یہ یقین تھا کہ مصر وروم میں اسلامی تصنیفات کا جو بقیہ حصہ رہ گیا ہے،ان سے ایک ایسا سلسلہ تالیف ضرور تیار ہو سکتا ہے۔[۱۴]

علامہ شبلی نے روم،مصر اور شام کے کتب خانوں میں موجود نادر ونایاب کتابوں اور مخطوطوں کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان سے ضروری اقتباسات بھی نقل کیے تھے۔محمد یحییٰ تنہا سیر المصنفین میں لکھتے ہیں:

> مولانا نے اس سفر میں الفاروق کے لیے بھی کافی مواد بہم پہنچانے کی کوشش کی اور کوئی دقیقہ تلاش وجستجو کا باقی نہ رکھا،لیکن دل کی آرزو دل میں ہی رہی اور ناکام واپس آئے۔[۱۵]

محمد یحییٰ تنہا کے جملے ''ناکام واپس آئے'' سے مراد علامہ شبلی کا حضرت عمرؓ سے متعلق بعض نایاب

---

[۱۴] نعمانی،مولانا شبلی،سفر نامہ روم ومصر وشام،قومی پریس،دہلی،۱۳۱۹ھ،ص ۱۳

[۱۵] سیر المصنفین،جلد دوم،ص ۴۱۴

کتابوں کے حصول میں ناکام ہونا ہے، جیسا کہ علامہ موصوف نے خود علامہ مسعودی کی مشہور کتابیں ''اخبار الزمان'' اور ''کتاب الاوسط'' کے حوالے سے لکھا ہے:

اگرچہ یہ کتابیں فن تاریخ کی جان ہیں، لیکن قوم کی بدمذاقی سے مدت ہوئی ناپید ہوچکیں، میں نے صرف اس غرض سے کہ حضرت عمرؓ کے ان حالات کا پتہ لگ سکے، قسطنطنیہ کے تمام کتب خانے چھان مارے، لیکن کچھ کام یابی نہ ہوئی۔[۱۶]

بہر حال علامہ موصوف نے الفاروق میں جن قدماء اور متاخرین کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، ان کی تفصیلات انہوں نے اپنی ''تمہید'' میں دی ہے۔ ان میں کتاب المغازی، الاخبار الطوال، الاحکام السلطانیۃ لماوردی، مقدمۃ ابن خلدون، کتاب الخراج، اخبار القضاۃ لمحمد بن خلف الوکیع، کتاب الاوائل لابی ہلال العسکری، محاسن الوسائل الی اخبار الاوائل، العقد الفرید، کتاب البیان والتبیین للجاحظ، کتاب العمدۃ لابن رشیق القیروانی، کتاب الامثال لمیدانی، سیرۃ العمرین لابن جوزی، ازالۃ الخفاء لشاہ ولی اللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں، حلیۃ الاولیاء، ابن عساکر، کنز العمال، ریاض النضرۃ وغیرہ جیسی کم مرتبہ کتابوں کی روایتوں کو خصوصی طور پر دیگر مستند کتابوں سے تحقیق و تصدیق کرنے کے بعد ہی قبول کیا ہے۔

محمد حسین ہیکل نے بھی اپنے مقدمہ میں تحقیق کے اصول و ضوابط سے بحث کی ہے، نیز واقعات کی صحت کو جانچنے کے لیے روایت و درایت کے قواعد کا بھی خیال رکھا ہے، چنانچہ بعض مؤرخین کی غلطیوں کی طرف نشان دہی کرتے ہوئے انہوں نے اپنا طریقہ کار واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

مؤرخین نے حضرت عمرؓ کے احترام میں اس قدر غلو کیا ہے اور ان کی سیرت میں ایسی باتیں شامل کر دی ہیں جو پیغمبرانہ معجزات سے زیادہ قریب ہیں اور جنھیں کوئی انتقاد پیشہ مؤرخ صحیح تسلیم نہیں کر سکتا...... اسی لیے پہلے میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ان واقعات سے صرف نظر کر لوں گا جنھیں عقل تسلیم اور تنقید ثابت نہیں کرتی، لیکن پھر مجھے محسوس ہوا کہ جن روایات کو ممکن الوقوع سمجھنے میں عقل تکلف کرتی ہے، ان کا اثبات مجھ پر فرض ہے، خاص طور پر اس لیے کہ مؤرخین نے یہ روایات علی التواتر نقل کی ہیں...... پھر بھی میں نے کوشش کی ہے ان واقعات کی توضیح و تفسیر میں حتی الامکان علمی بحث و انتقاد سے کام لوں۔[۱۷]

البتہ محمد حسین ہیکل نے اپنے منہج تحقیق کی بھرپور وضاحت نہیں کی ہے، واقعات کے ضبط و تحریر میں

---

[۱۶] نعمانی، علامہ شبلی، الفاروق، جے ایم سی انڈیا پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۴، ص ۴۰

[۱۷] ھیکل، محمد حسین، الفاروق عمر، مؤسسۃ ھنداوی للتعلیم والثقافۃ، القاھرۃ، ۲۰۱۴، ص ۱۶

ان کا انداز بیان ایک قصہ نگار کی طرح نظر آتا ہے، جب کہ علامہ شبلی نے ایک مؤرخ کی حیثیت سے تاریخی حقائق کا ذکر کیا ہے اور تفصیلی گفتگو سے اجتناب کیا ہے۔ جہاں تک مصادر و ماخذ کی بات ہے تو محمد حسین ہیکل نے بھی اس کا ذکر اپنے مقدمہ میں کیا ہے، نیز آخر میں ان کی فہرست دی ہے، ان میں مقدمۃ ابن خلدون، تاریخ الیعقوبی، کتاب الخراج، العقد الفرید، کتاب المعارف، فتوح البلدان، مروج الذہب ومعادن الجواھر، الطبقات الکبریٰ، کتاب المعارف، وفیات الاعیان، عمرو بن العاص، عبقریۃ عمر، فتوح مصر و اخبارھا، عین الاخبار، الامامۃ والسیاسیۃ، تاریخ دمشق، حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر والقاھرۃ، فجر الاسلام، الاغانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں ابتدائی سات یا آٹھ کتابوں سے علامہ شبلی نعمانی نے بھی استفادہ کیا ہے، البتہ محمد حسین ہیکل نے بعض اہم مستشرقین جیسے سر ولیم میور، ڈی ایس مارگولیوتھ، اولیری، ایڈورڈ گبن وغیرہ کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے، مولانا شبلی نعمانی کے مصادر و ماخذ میں ان کتابوں کا ذکر نہیں۔

ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی نے علامہ شبلی اور محمد حسین ہیکل کے بالمقابل اپنے مقدمہ میں منہج تحقیق کے متعلق بہت ہی مختصر گفتگو کی ہے، البتہ ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں حتی الامکان صحیح روایات تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

ان تاریخ عصر الخلفاء الراشدین ملیء بالدروس و العبر، و ھی متناثرۃ فی بطون الکتب و المصادر والمراجع، سواء کانت تاریخیۃ أو حدیثیۃ أو فقھیۃ أو ادبیۃ أو تفسیریۃ أو کتب التراجم والجرح والتعدیل، فقمت بدراستھا حسب وسعی و طاقتی، فوجدت فیھا مادۃ تاریخیۃ غزیرۃ یصعب الوقوف علی حقیقتھا فی الکتب التاریخیۃ المعروفۃ والمتداولۃ، فقمت بجمعھا و ترتیبھاو توثیقھا وتحلیلھا۔[۱۸]

خلفائے راشدین کے دور کی تاریخ عبرت و موعظت سے لبریز ہے اور مراجع و مصادر کی کتابوں میں خواہ وہ تاریخی ہوں، فقہی ہوں، ادبی ہوں، یا حدیث، تفسیر تراجم اور جرح و تعدیل کی کتابیں ہوں، سب میں دروس و عبر کے موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی طاقت و کوشش کے مطابق ان کتابوں کو کھنگالا ہے اور دوران تالیف مجھے کئی طرح کے ان تاریخی روایات سے سابقہ پڑا جن کی تہہ تک پہنچنا اور اس کی حقیقت کا جاننا معروف و متداول تاریخی کتابوں میں بہر حال ایک مشکل چیز ہے۔ اسی لیے میں نے ان روایتوں کو اکٹھا کیا، پھر ترتیب دیا، اصل حوالہ جات سے موازنہ کیا اور پھر تحقیق و تنقیح کے میزان پر اسے تولا۔

---

[۱۸] الصلابی، علی محمد محمد، أمیر المؤمنین عمر بن الخطابؓ شخصیتہ و عصرہ، مکتبۃ التابعین، القاھرۃ، ۲۰۰۲، ص ۶

اسی طرح محمد الصلابی نے مقدمہ میں بنیادی ماخذ و مصادر سے بحث نہیں کی ہے، البتہ آخر میں مصادر و مراجع کے تحت کل اکتیس ثانوی مآخذ کی کتابوں کا تذکرہ ضرور کیا ہے۔ بعض اہم مراجع و مصادر میں اخبار القضاۃ، اعلام الموقعین عن رب العالمین، اخبار عمرو اخبار عبداللہ بن عمر، اتمام الوفاء فی سیرۃ الخلفاء، اشھر مشاہیر الاسلام فی الحرب و السیاسیۃ، اصحاب الرسول، اولیات الفاروق، الاتقان فی علوم القرآن، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، الاسلام و حرکۃ التاریخ، استخلاف ابی بکر الصدیق وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے چند ایک کو ہی علامہ شبلی نعمانی اور محمد حسین ہیکل نے اپنے مراجع و مصادر میں جگہ دی ہے۔ اسی طرح الصلابی کے یہاں روایت و درایت کے اصولوں کا اہتمام بھی شاذونادر نظر آتا ہے۔ بہر حال ان تفصیلات سے واضح ہو جاتا ہے کہ منہج تحقیق کے اعتبار سے 'الفاروق' کو دونوں کتابوں پر فوقیت حاصل ہے، البتہ محمد حسین ہیکل کی کتاب اس سے قریب تر ہے۔ اب ذیل میں حضرت عمر فاروق سے متعلق بعض اہم واقعات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے:

غزوہ بدر: علامہ شبلی نعمانی کے مطابق غزوہ بدر کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ سے نکلنا، قریش کے قافلہ کو لوٹنے کے لیے نہیں بلکہ اہل مکہ کے حملہ کا دفاع کرنے کے لیے تھا۔ انہوں نے دلیل میں سورۃ الانفال کی آیت کریمہ ۵-۷ پیش کی ہے اور اس سے ثابت کیا ہے کہ یہ صرف دفاعی حملہ تھا۔ یوں بھی ابوسفیان کے قافلہ میں کل ۴۰ افراد تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تین سو صحابہ کرام کے ساتھ نکلے تھے تو ظاہر ہے کہ ان کا مقصد قافلہ لوٹنا نہیں تھا۔[19] مولانا مودودی نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا ہے اور بتایا ہے کہ سیرت و مغازی کی کتابوں میں درج روایات غلط ہیں کہ آپؐ پہلے قافلہ لوٹنے نکلے تھے، پھر چند میل بعد جب معلوم ہوا کہ مکہ سے فوج بھی آرہی ہے تو باہمی مشوروں سے طے کیا گیا کہ فوج پر حملہ کیا جائے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ جب آپؐ گھر سے نکلے تھے تو ہی طے ہو چکا تھا کہ فوج کا مقابلہ کرنا ہے اور اسی وقت مشاورت بھی ہوئی تھی۔[20] محمد حسین ہیکل اور علی محمد محمد الصلابی نے اپنی کتابوں میں اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔

غزوہ احد: غزوہ احد میں جب وقتی طور پر مسلمانوں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[19] الفاروق، صفحات ۴۵-۴۶

[20] مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، سن اشاعت غیر مذکورہ، جلد دوم، صفحات ۱۳۱-۱۳۲

کی شہادت کی افواہ اڑی تو اس وقت بعض مسلمانوں نے بھاگ کر مدینہ کا رخ کیا، کچھ نے لڑ کر اپنی جان دے دی اور بعض افراد مایوس ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ علامہ شبلی نے حضرت عمرؓ کو آخر الذکر درجے میں رکھا ہے اور دلیل میں علامہ طبری، قاضی ابویوسف، سیرت ابن ہشام کی روایات نقل کی ہیں، نیز انہوں نے علامہ بلاذری کی ''انساب الاشراف'' کی روایت: ''حضرت عمرؓ ان لوگوں میں سے تھے جو جنگ احد میں بھاگ گئے تھے، لیکن خدا نے ان کو معاف کر دیا'' اور ایک دوسری روایت جس میں انہوں نے احد کی لڑائی میں ثابت قدم نہ رہنے کی وجہ سے اپنے بیٹے کے وظیفہ کو لوگوں کی توجہ دلانے کے بعد بھی ایک شخص کے مقابلے کم رکھا تھا، کو قابل اعتناء نہیں سمجھا اور لکھا ہے کہ یہ روایت درایۃً غلط ہے کیوں کہ معرکہ جہاد سے بھاگنا ایک ایسا ننگ تھا جس کو کوئی شخص علانیہ تسلیم نہیں کرے گا، نیز اس روایت کی سند میں عباس بن عبداللہ الباکسائی اور عنیض بن اسحق دونوں مجہول الحال ہیں اور دیگر تمام روایات بھی اس کے برعکس ہیں۔[21] محمد حسین ہیکل نے بھی حضرت عمر کو مایوسی کی حالت میں بیٹھا ہوا لکھا ہے۔[22] البتہ علی محمد محمد الصلابی نے اس واقعہ کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

واقعہ قرطاس: اہل علم، محققین اور مستشرقین کے درمیان یہ واقعہ شروع سے ہی موضوع بحث رہا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے تین دن پہلے حالت مرض میں جب بعض مسلمان ان کے پاس عیادت کے لیے جمع تھے، فرمایا کہ کاغذ اور قلم لاؤ تا کہ میں ایسی ہدایت تم لوگوں کے لیے لکھ دوں کہ پھر کبھی گم راہ نہ ہوگے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے حاضرین سے فرمایا کہ آپؐ کو درد کی شدت ہے، انہیں تنگ نہ کیا جائے، یوں بھی ہمارے لیے قرآن ہی کافی ہے۔ کچھ افراد نے کہا کہ نعوذ باللہ آپؐ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ کچھ روایتوں میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ہی اسے ھجر (ہذیان) سے تعبیر کیا تھا۔ جب آوازیں بلند ہوئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ چلے جاؤ، نبی کے سامنے بحث نہیں کرنی چاہیے۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس حوالے سے تین صفحات میں تفصیلی بحث کی ہے اور اس روایت کو سرے سے رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپؐ اس واقعہ کے اگلے چار دن زندہ رہے اور طبیعت بھی کافی سنبھل چکی تھی، لیکن آپؐ نے پھر دوبارہ اس حوالے سے کوئی ذکر نہیں کیا، پوری بیماری میں اس طرح کا کوئی دوسرا واقعہ موجود نہیں، یہ واقعہ صرف حضرت عبداللہ بن

---

[21] الفاروق، صفحات ۵۰-۵۱

[22] الفاروق عمر، ص ۶۲

عباس سے ہی مروی ہے، جب کہ اس وقت وہاں دیگر بڑے بڑے صحابہ کرام موجود تھے، ان کی عمر اس وقت تیرہ یا چودہ برس تھی اور خود بھی اس وقت وہاں موجود نہیں تھے، انہوں نے یہ واقعہ کس سے سنا؟ اس کی بھی وضاحت نہیں ملتی تو ایسے میں اس روایت کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی ہے۔ رہا سوال اس کا کوئی اس حوالے سے بخاری و مسلم کی حدیث پر شبہ کیا جائے کیوں کہ ان میں یہ واقعہ درج ہیں تو یہ نبی کریمؐ پر ہذیان اور حضرت عمرؓ پر گستاخی کا الزام لگانے سے نسبتاً آسان ہے۔[۲۳] محمد حسین ہیکل نے اس واقعہ کا سرسری ذکر کیا ہے اور آخر میں اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ شاید حضورؐ سب سے زیادہ حضرت عمرؓ کی رائے سے متاثر ہوئے تھے کیوں کہ وہ ان کے اخلاص کی صداقت اور رائے کی پاکیزگی سے واقف تھے۔[۲۴] علی محمد محمد الصلابی نے اس واقعہ کو صحیح تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اس وقت نبی کریمؐ کے پاس موجود تھے، نیز انہوں نے امام نوویؒ کی اس سلسلے میں بحث کو بھی نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپؐ جسمانی امراض و عوارض سے معصوم نہ تھے، تو ان کا یہ عمل شدت تکلیف کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور وہ تحریر بعض کے مطابق خلافت کی نامزدگی کی تھی یا بعض کے نزدیک اسلام کے اہم احکام کو ایک ساتھ جمع کرنے کی کوشش تھی۔ اسی طرح انہوں نے قاضی عیاض کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ''ہمارے لیے کتاب اللہ ہی کافی ہے'' کہہ کر آپؐ سے بحث کی تھی، نہ کہ ان کے فرمان کی تردید یا مخالفت کی تھی۔[۲۵]

علی محمد محمد الصلابی کی رائے زیادہ مناسب ہے۔ بخاری اور مسلم کی روایتوں کو اتنی آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے اور پھر متعدد مستند محققین و مؤرخین نے اس واقعہ کی تصدیق کی ہے، البتہ اہل تشیع کا یہ ماننا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو خلیفہ نامزد کرنا چاہتے تھے اور اسی کے لیے آپؐ نے کاغذ قلم منگایا تھا، یہ درست نہیں ہے کیوں آپؐ نے اپنے مرض الموت میں متعدد دفعہ حضرت ابو بکرؓ کو امامت کے لیے اپنا قائم مقام بنایا تھا، نیز ان کی خدمات اور رسول اللہؐ سے قربت کی بنا پر کوئی دوسرا اس کا حق دار تھا بھی نہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر نبی کریمؐ کیا تحریر کرانا چاہتے تھے؟ اتنا تو ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی بہت اہم اور ضروری چیز نہیں تھی، ورنہ آپؐ حضرت عمرؓ کی

---

[۲۳] الفاروق، صفحات ۶۰-۶۳

[۲۴] الفاروق عمر، ص ۷۰

[۲۵] أمیر المومنین عمر بن خطاب شخصیتہ وعصرہ، صفحات ۷۸-۸۰

رائے کو پسند نہیں کرتے، نیز اگر تحریر کرانا ہی چاہتے تو اس کے بعد بھی حکم دے کر لکھوا سکتے تھے یا اس حوالے سے وحی نازل ہو سکتی تھی، کیوں کہ آپؐ اس واقعہ کے بعد بھی تین چار دن زندہ رہے تھے۔ رہی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لفظ ''ہذیان'' منسوب کرنے کی تو ہمیں اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ''درد کی تکلیف'' یا دیگر مناسب الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ حضور اکرمؐ انسان ہی تھے۔ اگر ہم انہیں انسان تسلیم کرتے ہیں تو یہ بات ماننا ہوگی کہ انہیں بھی درد یا تکلیف ہو سکتی تھی۔

حضرت عمرؓ کا وفات رسولؐ پر رد عمل: تاریخ میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے اور مسجد نبوی میں جا کر فرمایا کہ جو شخص یہ کہے گا کہ آپؐ وفات پا گئے، اس کا میں سر قلم کر دوں گا۔ علامہ شبلی نعمانی نے ان کے اس عمل کو مصلحت پر قیاس کیا ہے اور لکھا ہے کہ چوں کہ مدینہ میں کثرت سے منافقین کا گروہ موجود تھا، جو فتنہ پردازی کے لیے آپؐ کی وفات کا منتظر تھا، اس لیے انہوں نے مصلحتاً اس خبر کو پھیلنے سے روکا ہوگا، البتہ وہ اس حوالے سے کوئی مدلل دلیل نہیں دے سکے ہیں اور اس کمی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مشکل یہ ہے کہ صحیح بخاری وغیرہ میں اس قسم کی تصریحات موجود ہیں جو ہمارے اس قیاس کے مطابق نہیں ہو سکتیں۔[۲۶]
محمد حسین ہیکل نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا: منافقین کہتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے وفات پائی، واللہ آپؐ نے وفات نہیں پائی، بلکہ موسیٰ بن عمران کی طرح اپنے رب کے پاس تشریف لے گئے ہیں جو چالیس روز غائب ہو کر واپس آ گئے تھے، حالاں کہ ان کی نسبت بھی کہا جاتا تھا کہ وفات پا گئے۔ خدا کی قسم! آپؐ بھی موسیٰ بن عمران کی طرح واپس ہوں گے اور ان لوگ کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے، جو کہتے ہیں کہ آپؐ نے وفات پائی۔[۲۷] علی محمد محمد الصلابی نے محمد حسین ہیکل ہی کی رائے کو معمولی ردوبدل کے ساتھ لکھا ہے۔[۲۸]

علامہ شبلی کا موقف بعینہ تو درست نہیں، البتہ اس سے قریب تر ضرور ہے، کیوں کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ایک روایت ہے کہ وہ نبی اکرمؐ کا سر اپنے کندھے پر لیے ہوئے تھیں، اسی دوران آپؐ کا سر

---

[۲۶] الفاروق، صفحات ۶۲-۶۳

[۲۷] الفاروق عمر، ص ۲۷

[۲۸] ملاحظہ ہو: أمیر المومنین عمر بن خطاب شخصیتہ وعصرہ، ص ۸۰

مبارک ایک طرف لڑھک گیا تو انہیں لگا کہ آپؐ پر غشی طاری ہو گئی ہے تو انہوں نے چادر اڑھادی تھی، اسی دوران حضرت عمرؓ اور مغیرہ بن شعبہؓ تشریف لائے۔ حضرت عمرؓ نے نبی کریمؐ کو دیکھ کر کہا کہ ہائے غشی! آپؐ پر غشی کی شدت کتنی ہے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں صحابہ کرام جانے لگے تو دروازے پر مغیرہ بن شعبہؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ نبی کریمؐ کا انتقال ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا: تم جھوٹ بولتے ہو، ان کا انتقال اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اللہ تعالیٰ منافقین کو ختم نہ کردے۔[۲۹] یعنی کہیں نہ کہیں ان کے دل میں منافقین سے خدشہ ضرور تھا۔ محمد بن عبدالکریم شہرستانی کی کتاب الملل والنحل میں موسی بن عمران کی جگہ عیسیٰ علیہ السلام کا نام درج ہے۔ رہی بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ آسمان پر اٹھالیے جانے کی تو یہ نظریہ نہ تو روایۃً درست ہے اور نہ ہی درایۃً، اس لیے کہ آپؐ کا جسم اطہر موجود تھا اور وہ کہیں غائب نہیں ہوا تھا۔ محمد حسین ہیکل کی منقولہ موسیٰ بن عمران والی ہی روایت طبری میں موجود ہے، نیز لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بعد میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ایک موقع پر بتایا تھا کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ رہنے کا استدلال قرآن کریم کی آیت کریمہ "وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شهداء عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شهيداً"[۳۰] سے کیا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ آپؐ اپنی امت کے آخری اعمال دیکھنے تک کے لیے زندہ رہیں گے۔[۳۱]

سقیفہ بنی ساعدہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں پیش آنے والے مسئلہ یعنی خلافت کی نزاع پر علامہ شبلی نے تفصیلی بحث کی ہے اور سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے کردار کو حق بجانب قرار دیا ہے۔ در حقیقت اسلام کے مخالفین بالخصوص مستشرقین کی جانب سے یہ الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام ان کی تجہیز و تکفین کے بجائے مسئلہ خلافت میں الجھ گئے تھے اور اس میں خلیفہ اول و دوم پیش پیش تھے۔ علامہ شبلی کی یہ بحث تین صفحات پر مشتمل ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام وفات رسولؐ کے فوراً بعد

---

[۲۹] مسند الامام احمد بن حنبل، عالم الکتب، للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، ۱۹۹۸، رقم الحدیث: ۲۶۳۶۵، المجلد الثامن ج ۸، ص ۴۲۷

[۳۰] البقرۃ: ۱۴۳

[۳۱] الطبری، محمد بن جریر، تاریخ الطبری، تاریخ الرسل والملوک، دار المعارف، القاہرۃ، ۱۹۶۸، الطبعۃ الثانیۃ، الجزء الثالث، ص ۲۱۱

خلافت کے معاملہ میں تین گروہ میں تقسیم ہو گئے تھے۔اول انصار، دوم مہاجرین، سوم بنو ہاشم اور تینوں ہی طبقات خلافت حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے۔دلیل میں انہوں نے مسند ابو یعلی، فتح الباری اور صحیح بخاری کی روایات نقل کی ہیں۔مہاجرین کے پیشوا حضرت ابو بکرؓ، انصار کے رئیس سعد بن عبادہؓ اور بنو ہاشم کے سردار حضرت علیؓ تھے، نیز جس طرح سے حضرت عمرؓ نبی کریمؐ کو چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے تھے، اسی طرح حضرت علیؓ بھی آپؐ کو چھوڑ کر چلے آئے تھے اور حضرت فاطمہؓ کے گھر میں بنو ہاشم کے بااثر افراد جمع تھے۔وہ سقیفہ بنی ساعدہ اس لیے نہیں گئے تھے کہ وہاں ان کا ہم نوا کوئی تھا ہی نہیں۔آخر میں شبلی نعمانی نے بعض سوالات قائم کیے ہیں کہ کیا حضرت عمرؓ نے خود خلافت کا سوال اٹھایا تھا؟ کیا حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ اپنی مرضی سے سقیفہ بنی ساعدہ گئے تھے؟ کیا حضرت علیؓ اور بنو ہاشم یا انصار خلافت کی فکر سے بالکل فارغ تھے؟ ظاہر ہے کہ ان سب کے جوابات نفی میں ہیں تو ایسی حالت میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ صحیح تھا یا غلط؟ پھر خود ہی جواب دیا ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب منافقین کی ایک بڑی تعداد مدینہ میں موجود تھی، جو اسلام کو ختم کرنے کے درپے تھی اور انصار نے اس بحث کو پہلے ہی چھیڑ کر حالات کو مزید نازک بنا دیا تھا، تو بہتر یہ تھا کہ فوراً خلیفہ کا انتخاب کر لیا جائے، چنانچہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے یہی کیا تھا، ورنہ مسلمان خانہ جنگی میں مبتلا ہو سکتے تھے، ظاہر ہے کہ ان کے اس عمل کو غلط نہیں کہا جا سکتا ہے۔آخر میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر تمام مسلمانوں نے ان کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیا تھا، سوائے بنو ہاشم کے اور وہ حضرت فاطمہؓ کے گھر پر جمع ہو کر باہم مشورہ کرتے رہتے تھے۔علامہ شبلی نے ابن ابی شیبہ اور علامہ طبری کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہؓ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا کہ آپ ہمیں سب سے زیادہ محبوب ہیں، لیکن ان لوگوں کی وجہ سے گھر میں آگ لگا دوں گا۔اس روایت کو انہوں نے درایتاً تسلیم کیا ہے اور کہا ہے حضرت عمرؓ کی تندی اور تیز مزاجی سے یہ حرکت کچھ بعید نہیں، البتہ سند کی صحت سے لاعلمی ظاہر کی ہے۔[۳۲] محمد حسین ہیکل نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ وفات رسولؐ کے بعد حضرت عمرؓ نے پہلے حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراحؓ سے کہا تھا کہ ہاتھ بڑھائیں تاکہ میں خلافت کی بیعت کروں۔انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ کیا تم مجھ سے بیعت کرو گے جب کہ ہمارے درمیان ثانی اثنین، صدیقؓ موجود ہیں تو انہوں نے اپنی بات واپس لے لی۔اسی دوران

---

[۳۲] الفاروق، صفحات ۳-۶۸

ان دونوں کو سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے جمع ہونے اور امارت حاصل کرنے کی کوشش کی خبر ملی تو انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کو زبردستی بلایا اور سقیفہ بنی ساعدہ کا رخ کیا پھر وہاں طویل بحث کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر سوائے سعد بن عبادہ کے سب نے بیعت کی۔ مزید برآں انہوں نے حضرت علیؓ اور بنو ہاشم کے بیعت سے انکار کی روایات پر شبہ ظاہر کیا ہے۔[۳۳] علی محمد محمد الصلابی نے اس واقعہ کا سرسری ذکر کیا ہے اور لفظی رد و بدل کے ساتھ تقریباً وہی باتیں لکھی ہے جو عام تاریخوں میں درج ہیں، البتہ انہوں نے سعد بن عبادہ یا حضرت علیؓ اور بنو ہاشم وغیرہ کے بیعت نہ کرنے کا ذکر نہیں کیا ہے۔[۳۴] ان سب سے قطع نظر تینوں مصنفین میں جو بات مشترک ہے وہ یہ کہ تینوں نے ہی سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت عمرؓ کے کردار کو مختلف الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس موقع پر امت مسلمہ کو انتشار سے بچانے میں ان کا سب سے اہم کردار رہا ہے۔

اس واقعہ کی مزید تحقیق میں مختلف باتیں سامنے آئیں۔ حضرت علیؓ نے بیعت کی تھی یا نہیں؟ اس حوالے سے مؤرخین اور محققین میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے، بعض نے لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد (چھ مہینہ) بیعت کی تھی۔ علامہ طبری کے مطابق انہوں نے چالیس دن بعد بیعت کی تھی اور یہی رائے ابن خلدون نے بھی اختیار کی ہے۔ اسی طرح مختلف محققین نے لکھا ہے کہ جب مسجد نبوی میں عام بیعت ہوئی تو اس میں وہ بھی شامل تھے، نیز بیعت نہ کرنے کی روایتیں خلافت راشدہ کے آخری دور یا عباسی دور میں گڑھی گئی ہیں۔ جہاں تک سعد بن عبادہؓ کا معاملہ ہے تو اس بات پر اکثریت کا اتفاق ہے کہ انہوں نے آخر تک بیعت نہیں کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کو اس مسئلہ یعنی سعد بن عبادہ کی عدمِ بیعت کی جانب توجہ دلائی، لیکن انہوں نے بشیر بن سعدؓ کے کہنے پر سعد بن عبادہ سے کوئی تعارض نہیں کیا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ علامہ طبری کے مطابق انہوں نے بیعت کر لی تھی، یہی رائے علی محمد محمد الصلابی کی ہے اور انہوں نے اپنی کتاب ''الانشراح و رفع الضیق بسیرۃ ابی بکر'' میں اس کی تفصیل لکھی ہے اور ان تمام روایات کو غیر مستند قرار دیا ہے جن میں سعد بن عبادہؓ کی بیعت کی نفی کی گئی ہے، نیز انہوں نے دلیل میں علامہ ذہبیؒ کا قول نقل کیا ہے۔ رہی بات حضرت عمرؓ کی جانب سے حضرت فاطمہؓ کے گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دینا یا آگ لگا دینا، انہیں

---

[۳۳] الفاروق عمر، صفحات ۷۵-۷۷

[۳۴] أمیر المومنین عمر بن خطاب شخصیتہ و عصرہ، صفحات ۸۲-۸۳

لات مارنا جس سے ان کا اسقاط حمل ہو گیا اور حضرت علیؓ کی مشکیں باندھ کر بیعت کے لیے لانا وغیرہ تو یہ سب فرضی باتیں ہیں اور یہ تمام روایتیں ضعیف ہیں۔[۳۵] البتہ علامہ طبری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ کے گھر آئے اور وہاں حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور مہاجرین میں سے کچھ افراد موجود تھے، انہوں نے فرمایا کہ چل کر بیعت کرو، ورنہ تم لوگوں سمیت اس گھر کو آگ لگا دوں گا۔ اس پر حضرت زبیرؓ تلوار سونت کر ان کی طرف بڑھے، لیکن ان کا پیر الجھا اور وہ گر پڑے تو تلوار ان کے ہاتھ سے نکل گئی، چنانچہ لوگوں نے ان کو پکڑ لیا۔[۳۶]

حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی: علامہ شبلی نعمانی نے ''الفاروق'' میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی کا واقعہ دو صفحہ میں مختصراً ذکر کیا ہے، اس میں انہوں نے معزولی کے تین اسباب بتائے ہیں۔ اول یہ کہ وہ فوج کے مصارف کا حساب کتاب نہیں دینے کو راضی تھے، کیوں کہ عہد صدیقی سے ہی ان کا یہی طرز عمل تھا۔ دوم انہوں نے ایک شاعر کو دس ہزار رقم بہ طور انعام دی تھی۔ سوم ان کو کسی خیانت یا ناراضگی کی بنیاد پر معزول نہیں کیا تھا، بلکہ حضرت عمرؓ نے جب دیکھا کہ لوگ ان کے مفتون ہوئے جا رہے ہیں، اس لیے ان کا معزول کرنا مناسب سمجھا تا کہ عوام یہ سمجھ لے کہ جو کچھ کرتا ہے، اللہ ہی کرتا ہے۔ مزید برآں علامہ نعمانی نے عام مؤرخین کے اس بیان کو کہ خلیفہ ہوتے ہی حضرت عمرؓ نے پہلا حکم حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی کا دیا تھا، غلط قرار دیا ہے، نیز اس حوالے سے انہوں نے ابن الاثیر پر تنقید کی ہے جو اسی رائے کے قائل تھے۔[۳۷] محمد حسین ہیکل نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی پر کافی تفصیل سے لکھا ہے اور اس موضوع پر تقریباً سات آٹھ صفحات قلم بند کیے ہیں۔ انہوں نے ابن اثیر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ فاروق اعظمؓ نے منصب خلافت پر فائز ہوتے ہی انہیں فوج کی سپہ سالاری سے معزول کر دیا تھا اور اس کے بعد انہیں فوج میں عضو معطل بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی مختلف وجوہات تھیں، جیسے عہد صدیقی میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے بنو تمیم کے سردار مالک بن نویرہ کو مرتد ہونے کے جرم میں قتل کر کے اس کی بیوی لیلی سے شادی کر لی تھی، جب کہ انہوں نے دوبارہ اسلام قبول

---

[۳۵] تاریخ الطبری، تاریخ الرسل والملوک، الجزء الثالث، صفحات ۲۱۸-۲۲۳، نیز ھیکل، محمد حسین، الصدیق ابو بکر، مؤسسۃ ھنداوی للتعلیم والثقافۃ، القاھرۃ، ۲۰۱۲، صفحات ۴۵-۶۳

[۳۶] تاریخ الطبری، تاریخ الرسل والملوک، الجزء الثالث، ص ۲۰۲

[۳۷] الفاروق، صفحات ۱۲۵-۱۲۷

کرلیا تھا، حالاں کہ اس حوالے سے روایتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ کو اس حوالے سے غلط فہمی ہوگئی تھی۔ بہر حال حضرت عمرؓ نے اسی وقت ان کے اس جرم کو ناپسند کیا تھا اور خلیفہ اول سے انہیں معزول کرنے اور سزا دینے کی سفارش کی تھی، البتہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان کی رائے قبول نہیں کی تھی اور انہیں مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کے لیے یمامہ بھیج دیا تھا۔ یہاں بھی انہوں نے مجاعہ کی بیٹی سے شادی کرلی تھی، اس پر تو حضرت ابو بکرؓ بھی خفا ہوئے تھے، لیکن انہوں نے پھر بھی انہیں معزول نہیں کیا بلکہ عراق کی طرف بھیج دیا تھا۔ یہاں انہوں نے جب ہذیل کی آبادی پر حملہ کیا تو دو ایسے آدمی بھی قتل کردیے جن کے مسلمان ہونے کا شہادت نامہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس موجود تھا۔ اس حوالے سے بھی حضرت عمرؓ نے خلیفہ اول سے انہیں معزول کرنے کی سفارش کی، لیکن حضرت ابو بکرؓ نے انکار کردیا تھا۔ صاحب کتاب نے حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ کے درمیان ناراضگی کی ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ ممکن ہے کہ خلیفہ دوم جنگ احد میں خالد بن ولید کی جنگی مہارت کو نہ بھول سکے ہوں جس کی وجہ سے مسلمانوں کو وقتی شکست کا سامنا کرنا پڑا، نیز انہوں نے نبی کریمؐ پر حملہ کرنے کی گستاخی کی تھی، پھر رکاوٹ بھی حضرت عمرؓ نے ہی اس وقت ڈالی تھی۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ وجہ چاہے جو بھی ہو لیکن حضرت عمرؓ نے خالد بن ولیدؓ سے محبت کا برتاؤ کبھی نہیں کیا اور اسی طرح خالد بن ولیدؓ جب بھی حضرت ابو بکرؓ کی جانب سے اپنی مرضی کے خلاف کوئی حکم پاتے تو اس میں فاروق اعظمؓ کا ہی ہاتھ سمجھتے تھے۔ پھر جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے خلیفہ اول کے حکم کے مطابق انہیں شام کا سپہ سالار بنادیا، لیکن ایک مہینہ بعد بھی وہ رومیوں پر غالب نہیں آسکے، چنانچہ ان کو معزول کرنے کا ان کے نزدیک سب سے اچھا موقع یہی تھا تو انہوں نے خلیفہ اول کی وفات کے دوسرے ہی دن ان کو معزول کرنے کا حکم جاری کیا اور ان کو فوج کے صرف اس حصے کی امارت دی جس کے امیر حضرت ابو عبیدہؓ تھے۔ اس کے بعد سنہ ۱۷ ہجری میں وہ تمام فوجی خدمات سے معزول کردیے گئے۔ معزولی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت خالد بن ولید نے شاعروں اور سورماؤں کو بہ کثرت انعامات اور بخشش سے نوازا تھا، اس میں اشعث بن قیس کو دیے گئے انعامات کا قصہ بہت مشہور ہوا تھا، جب کہ حضرت عمرؓ نے انہیں حکم دیا تھا کہ جتنا مال تم کو ملا ہے اسے کم زور مہاجرین کے لیے وقف کردو اور وہ اسے طاقت ور، عزت والے اور شعراء وغیرہ پر لٹا رہے تھے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ آرمینیا کے ایک مقام آمد میں انہوں نے ایک مرتبہ حمام میں شراب ملے ہوئے پانی سے مالش کرائی تھی، نیز خلیفہ دوم کو یہ بھی ڈر تھا کہ لوگوں کی

گرویدگی حضرت خالد بن ولیدؓ کو گم راہ نہ کردے اور وہ خود مختار نہ بن بیٹھیں کہ مسلمانوں میں بغاوت پیدا ہو جائے جو اسلامی حکومت کے لیے خطرہ ثابت ہو۔

علامہ شبلی نعمانی نے حضرت خالد بن ولید کی معزولی کے متعلق جو روایت کہ: ''حضرت عمرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو اس لیے معزول کیا تھا کہ لوگ ان کے مفتون ہوئے جا رہے تھے''، محمد حسین ہیکل نے اس کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ غیر مستند ہے، نیز وہ مدینہ آئے ہی نہیں تھے۔ اسی طرح انہوں نے مالک بن نویرہ کے قتل کو بھی معزولی کی وجہ نہیں مانی ہے۔ ان کی نظر میں اصل سبب یہ تھا کہ دونوں کے درمیان باہمی اعتماد کا رشتہ باقی نہیں تھا، عہد فاروقی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ مزید برآں انہیں ''سیف اللہ'' میں ایک طرح کی خود پسندی نظر آتی تھی جو انہیں جلد بازی میں جنگ کی طرف لے جاتی تھی۔ انہوں نے فتح مکہ اور مالک بن نویرہ کی مثال اسی لیے دی ہے۔ صاحب کتاب نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بار حضرت علیؓ کے سامنے خالد بن ولیدؓ کی معزولی پر ندامت کا اظہار بھی کیا تھا۔[۳۸]

علی محمد محمد الصلابی نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور تقریباً دس بارہ صفحات میں اس موضوع کا احاطہ کیا ہے۔ انہوں نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ خالد بن ولیدؓ پہلی بار ۱۳ ہجری میں شام کے سپہ سالار اعظم کے عہدے اور قیادت عامہ سے معزول کیے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی وہ حضرت عمرؓ کے طریقہ کے مطابق کام کرنے کو تیار نہیں تھے۔ دلیل میں انہوں نے مالک بن انسؓ سے ایک روایت پیش کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو لکھا کہ میری اجازت کے بنا کسی کو ایک اونٹ یا بکری مت دینا۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں جس طرح سے کام کرتا ہوں، کرنے دیں یا آپ کا کام آپ کے حوالے۔ یہی جواب انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کو بھی دیا تھا، انہوں نے اسے برداشت کر لیا تھا، لیکن حضرت عمرؓ نے انہیں معزول کر دیا۔ بعد میں بھی انہوں نے جب بھی کسی منصب کی ان کو پیش کش کی تو انہوں نے آزادانہ کام کرنے کی بات کہی جو حضرت عمرؓ کے نزدیک قابل قبول نہیں تھی۔ بہر حال خالد بن ولیدؓ چار سال تک حضرت ابو عبیدہؓ کی قیادت میں کام کرتے رہے، اسی دوران انہوں نے 'قنسرین' فتح کیا تو ابو عبیدہؓ نے انہیں وہاں کا امیر بنا دیا تھا۔ سنہ ۱۷ ہجری میں ان کی دوسری معزولی ہوئی اور وہ تمام تر فوجی خدمات سے معزول کر دیے گئے، نیز انہیں مدینہ طلب کر لیا

---

[۳۸] الفاروق عمر، صفحات ۸۰-۹۸، ۸۲-۲۵۵، ۱۰۰-۲۷۴

گیا۔اس کی وجہ یہ بنی کہ انہوں نے اشعث بن قیس الکندی کو بطور عطیہ و بخشش دس ہزار درہم دیے۔ حضرت عمرؓ کو جب اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے تحقیق کرائی کہ انہوں نے یہ رقم اپنی جیب سے دی ہے یا مال غنیمت سے ناجائز تصرف کر کے؟ اس میں حضرت خالدؓ مؤخر الذکر الزام سے بری ثابت ہوئے۔وہ واپس جب مدینہ آئے تو حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ میرے معاملہ میں اچھا نہیں کر رہے ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے پاس اتنا مال کہاں سے آیا؟ حضرت خالد نے کہا کہ مال غنیمت میں ملے ہوئے ساٹھ ہزار سے جو رقم زیادہ ہو وہ آپ لے لیں، حساب ہوا تو بیس ہزار رقم زائد ملی، چنانچہ اسے بیت المال میں داخل کرا دیا گیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا! اے خالد، اللہ کی قسم، تم مجھ پر مہربان ہو اور تم میرے نزدیک بہت محبوب ہو، آج کے بعد تم مجھے کسی چیز پر ملامت نہ کرنا۔اس کے بعد حضرت عمرؓ نے پوری مملکت اسلامیہ میں یہ فرمان جاری کیا کہ میں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو کسی ناراضگی اور خیانت کی بنیاد پر معزول نہیں کیا ہے، بلکہ صرف اس ڈر کی وجہ سے کہ لوگ کہیں ان ہی کی ذات پر بھروسہ کرنے لگیں اور ان کی وجہ سے آزمائش میں پڑ جائیں، میں نے مناسب سمجھا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ ہی حقیقی کارساز ہے، وہ فتنہ کا نشانہ نہ بنیں۔[۳۹]

راقم الحروف کے نزدیک علامہ شبلی اور علی محمد محمد الصلابی کی رائے زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ حضرت عمرؓ کا رویہ اپنے عمال اور حکام کے ساتھ بھی بہت سخت تھا۔وہ معمولی سے معمولی باتوں پر اپنے عمال اور حکام کو سزا دیا کرتے تھے اور بسا اوقات معزول بھی کر دیا کرتے تھے۔ قیس بن ابی حازم سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک انصاری نوجوان کو باشندگان حیرہ کا افسر بنا کر بھیجا تو اس نے عمرو بن حیان کے گھر قیام کیا اور کھانے کے وقت ان کا مذاق اڑایا اور ان کی داڑھی پکڑلی۔ حضرت عمرؓ کو جب اس کی خبر ملی تو انہوں نے فوراً اسے معزول کر دیا۔اسلامی تاریخ میں اس طرح کے بہ کثرت واقعات درج ہیں، چنانچہ اگر انہوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو حساب نہ دینے یا اشعث بن قیس کو دس ہزار کی رقم دینے پر معزول کر دیا تھا تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔اسی طرح خالد بن ولیدؓ فوجی معاملات میں آزادی چاہتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ موقع پر موجود شخص زیادہ بہتر طریقے سے صورت حال کو سمجھ سکتا ہے، اس کے برعکس حضرت عمرؓ زیادہ تر معاملات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے، جیسا کہ انہوں نے جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ساتھ کیا تھا اور برابر ان کو ہدایات بھیجتے رہتے تھے۔مزید برآں ان کے

---

[۳۹] أمیر المومنین عمر بن خطاب شخصیتہ و عصرہ، صفحات ۴۱۸-۴۲۸

ذہن میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے حوالے سے لوگوں میں پھیل رہی غلط فہمی بھی تھی کہ حضرت سیف اللہ جس جنگ میں ہوتے ہیں، فتح مقدر ہو جاتی ہے۔اس غلط فہمی کو انہوں نے دور کرنا مناسب سمجھا اور ابو عبیدہؓ کو فوج کا سپہ سالار اعظم بنا دیا،ان کا یہ فیصلہ صحیح ثابت ہوا، چنانچہ اس کے بعد بھی مسلمانوں کو اسی طرح جنگ میں کامیابی ملتی رہی جیسے حضرت خالد بن ولیدؓ کی ماتحتی میں ملتی تھی۔ان تمام دلائل سے درایت کے اصولوں کے مطابق محمد حسین ہیکل کی تحریر کردہ درج بالا تمام دیگر روایتوں کی بھی نفی ہو جاتی ہے، کیوں کہ وہ تمام باتیں حضرت عمرؓ اور حضرت سیف اللہؓ جیسے عظیم صحابہ کرام کے شایانِ شان نہیں معلوم ہوتی ہیں۔بات بس اتنی تھی کہ دونوں شخصیتوں کی فکر اور طریقہ کار جداگانہ تھا، دونوں کو ہی اپنی رائے اور فیصلے پر اصرار تھا تو ایسے میں کسی ایک کو دین اور اسلام کی سربلندی کے لیے پیچھے ہٹنا ہی تھا، چنانچہ سپہ سالار اعظم نے خلیفہ وقت کے فیصلے کو ترجیح دی، کیوں کہ اسے کسی بھی عامل، حاکم، سپہ سالار اور دیگر حکام کی معزولی کا پورا اختیار ہوتا ہے، نیز حضرت خالد بن ولیدؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابی تھے، چنانچہ ان سے یہی امید بھی کی گئی تھی کہ وہ خلیفہ وقت کے فیصلہ کو خوش دلی سے قبول کریں۔

ذمیوں سے متعلق بعض احکام پر اعتراض: علامہ شبلی نعمانی نے اس میں حضرت عمرؓ کے ذریعے ذمیوں کو دیے گئے ان احکام کا ذکر کیا ہے جو بظاہر انصاف کے برخلاف ہیں، جیسے ذمی وضع قطع اور لباس میں مسلمانوں کی مشابہت نہ اختیار کر سکیں، کمر میں زنار باندھیں، لمبی ٹوپی پہنیں، گھوڑوں پر کاٹھی کسیں، نئی عبادت گاہیں نہ بنائیں، شراب اور سور نہ بیچیں، ناقوس نہ بجائیں، صلیب نہ لٹکائیں۔اسی طرح بنو تغلب کو یہ حکم تھا کہ وہ اپنے بچوں کو اصطباغ (بپتسمہ) نہ دیں۔صاحب کتاب نے معترضین کی جانب سے ان تمام احکام پر کیے گئے اعتراضات کا دفاع کیا ہے اور مختلف دلائل سے خلیفہ دوم کے اس طرز عمل کو سراہا ہے۔نیز انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے قومی خصوصیتوں کو باقی رکھنے کے لیے یہ تمام احکام جاری کیے تھے۔ان سے ذمیوں کی تذلیل اور تحقیر مقصود نہیں تھی۔لباس انہوں نے وہی پہننے کو کہا تھا جو عجمی پہلے سے پہنتے آئے تھے، کوئی نیا لباس ان کے لیے مقرر نہیں کیا تھا، زنار سے مراد پٹی ہے جو ذمی پہلے سے لگاتے رہے ہیں، نہ کہ اس سے مراد انگل برابر موٹا ایک قسم کا جنیو ہے، جیسا کہ عام فقہاء سمجھتے ہیں کہ اس سے ذمیوں کی تحقیر مقصود تھی، اسے منطقہ اور کستیج بھی کہا جاتا تھا۔دلیل میں انہوں نے کنز العمال، کتاب مروج الذہب اور التنبیہ والاشراف کی روایات نقل کی ہیں۔اسی طرح انہوں نے صلیب کو مسلمانوں کی مجلس میں نکالنے سے منع کیا تھا، ناقوس بجانے کی ممانعت صرف

نماز کے اوقات میں تھی، سور کو مسلمانوں کے احاطہ میں نہ لے جانے کا حکم دیا تھا۔اصطباغ نہ دینے کا حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ اگر کوئی عیسائی اسلام قبول کر لے تو اس کی نابالغ اولاد کا مذہب کیا ہوگا؟ وہ مسلمان سمجھی جائے گی یا اس کے خاندان والوں کو حق ہوگا کہ وہ اصطباغ دے کر عیسائی بنالیں؟ تو ظاہر ہے کہ مسلمان شخص کی اولاد بھی مسلمان سمجھی جائے گی، اسی لیے اصطباغ سے منع کیا گیا تھا، کیوں کہ عیسائی اپنے بچوں کو اصطباغ دے کر انہیں بلوغت کے بعد دیگر مذاہب کو قبول کرنے سے روک دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دلائل کی روشنی میں حضرت عمرؓ کے درج بالا احکام انصاف پر مبنی ہیں اور ان پر کیے گئے اعتراض کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی ہے۔[۴۰] محمد حسین ہیکل کی کتاب میں یہ امور و مسائل زیر بحث نہیں آئے ہیں۔البتہ علی محمد محمد الصلابی نے فقہاء کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسلامی حکومت میں ذمیوں کو اپنے مذہبی شعائر پر عمل کرنے کی پوری آزادی تھی اور جب تک کہ وہ ان شعائر کو علانیہ نہ کریں، یا صرف اپنے شہر، گاؤں اور علاقوں میں کریں، تب تک انہیں منع نہیں کیا جائے گا۔[۴۱]

جزیرہ نمائے عرب سے عیسائیوں اور یہودیوں کی جلاوطنی: حضرت عمرؓ پر ایک الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد میں یہودیوں کو فدک، حجاز اور خیبر سے اور عیسائیوں کو بلاوجہ نجران سے نکال باہر کیا تھا، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وہاں رہنے کی اجازت دی تھی۔ علامہ شبلی نے اس الزام کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ ان کا اخراج سیاسی ضرورتوں کے تحت ہوا تھا۔یہودیوں نے اپنی عادت کے مطابق مسلمانوں کے خلاف شرارتیں شروع کر دی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ایک مرتبہ بالاخانے سے ڈھکیل دیا تھا جس سے ان کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔اسی طرح نجران کے عیسائیوں نے چپکے چپکے جنگ کی تیاری شروع کر دی تھی اور کافی ہتھیار اور گھوڑے جمع کر لیے تھے، چنانچہ انہیں عراق اور شام کی طرف جلاوطن کر دیا گیا، البتہ ان کے ساتھ رحم دلی اور محبت کا سلوک کیا گیا اور عراق و شام میں ان کو نجران کی زمینوں کے برابر جگہ یا معاوضہ دیا گیا، نیز انہیں امن کا پروانہ بھی دیا گیا۔[۴۲] محمد حسین ہیکل نے یہودیوں اور عیسائیوں کو جلاوطن کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ حضرت عمرؓ پورے جزیرہ عرب کو ایک عقیدہ و مذہب میں دیکھنا چاہتے تھے۔انہوں نے یہ قدم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[۴۰] الفاروق، صفحات ۲۷۰-۲۷۳

[۴۱] أمیر المومنین عمر بن خطاب شخصیتہ و عصرہ، ص ۱۲۱

[۴۲] الفاروق، ص ۲۷۴

ایک فرمان ''سرزمین عرب میں دو دین نہیں رہ سکتے'' کی وجہ سے اٹھایا تھا۔ نیز وہ علامہ بلاذری اور بعض دیگر مؤرخین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ فاروق اعظمؓ اہل نجران کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر اسلام کے لیے خطرہ محسوس کرنے لگے تھے، چنانچہ انھوں نے سب کو جلاوطن کر دیا۔[۴۳] علی محمد محمد الصلابی نے یہود و نصاریٰ کی جلاوطنی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ انھوں نے ان عہد و پیمان کا خیال نہیں رکھا جو عہد نبوی میں آپؐ نے ان سے کیے تھے اور جن کی عہد صدیقی میں تجدید کی گئی تھی، مزید برآں دونوں ہی برابر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے، نیز انھوں نے ''جزیرہ عرب میں دو دین اکٹھے نہیں رہ سکتے'' کو بھی وجہ انخلاع بتایا ہے۔[۴۴]

راقم الحروف کی نظر میں محمد حسین ہیکل کی دلیل زیادہ مناسب ہوتی ہے، کیوں کہ اگر یہود و نصاریٰ نے بدعہدی یا سازشیں کی ہوتیں تو ان کے ساتھ حضرت عمرؓ اس قدر مہربانی اور شفقت سے پیش نہیں آتے کہ انھیں زمینوں کا معاوضہ دیا جائے یا اس کے بدلے انھیں شام و عراق میں زمینیں دی جائیں۔ اس لیے یہی بہتر رائے معلوم ہوتی ہے کہ وہ پورے جزیرہ عرب کو ایک عقیدے میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتے تھے، نیز ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ''سرزمین عرب میں دو دین نہیں رہ سکتے'' بھی موجود تھی، علامہ طبری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ آپؐ نے اپنے مرض الموت میں وصیت کی تھی کہ مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال باہر کرنا۔[۴۵]

حضرت شہر بانو کی حقیقت: علامہ شبلی نعمانی نے اس میں شہر بانو کے قصے کی حقیقت بیان کی ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب فارس فتح ہوا تو یزدگرد شہنشاہ فارس کی بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ حضرت عمرؓ نے ان کو عام لونڈیوں کی طرح بازار میں بیچنے کا حکم دیا، اس پر حضرت علیؓ نے انھیں ٹوکا اور کہا کہ شاہی خاندان کی خواتین کے ساتھ ایسا سلوک بہتر نہیں، بہتر ہوگا کہ پہلے ان کی قیمت کا اندازہ کر لیا جائے اور پھر انھیں پورے اہتمام کے ساتھ کسی کے سپرد کر دیا جائے اور اس سے قیمت وصول کر لی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرت علیؓ نے خود ان کو اپنے اہتمام میں لیا اور ایک امام حسینؓ کو اور ایک محمد بن ابی بکرؓ کو اور ایک عبداللہ بن عمرؓ کو عنایت کی۔ صاحب کتاب نے اس پورے واقعہ کو غیر مستند قرار دیا

---

[۴۳] الفاروق عمر، صفحات ۴۸۳-۴۸۴

[۴۴] أمیر المومنین عمر بن خطاب شخصیتہ وعصرہ، صفحات ۱۲۳-۱۲۴

[۴۵] تاریخ الطبری، تاریخ الرسل والملوک، الجزء الثالث، ص ۱۹۳

ہے اور لکھا ہے کہ یہ روایت صرف زمخشری کی ہے، جب کہ علامہ طبری، ابن الاثیر، یعقوبی، بلاذری اور ابن قتیبہ وغیرہ نے اس واقعہ کو لکھا ہی نہیں ہے۔ پھر حضرت عمرؓ کے عہد میں فارس مکمل فتح نہیں ہوا تھا اور نہ ہی مسلمانوں نے مکمل طور پر یزد گرد اور شاہی خاندان پر قابو پایا تھا کہ ان کی خواتین مدینہ لائی جائیں۔ مزید برآں اس وقت حضرت حسینؓ کی عمر صرف تیرہ سال تھی اور حضرت علیؓ کی ایسی مالی حیثیت نہیں تھی کہ وہ شہنشاہ کی اولاد کو خرید سکیں۔ غرض کسی بھی حیثیت سے اس واقعہ کو صحیح نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔[۴۶] محمد حسین ہیکل اور علی محمد محمد الصلابی نے اس واقعہ کا ذکر اپنی کتابوں میں نہیں کیا ہے۔

خلاصۂ کلام: درج بالا گفتگو سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی، محمد حسین ہیکل اور علی محمد الصلابی نے حضرت عمر فاروقؓ کی حیات وخدمات کو قلم بند کرنے میں کتنی محنت ومشقت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے، البتہ تینوں کے درمیان تقابلی مطالعہ میں علامہ شبلی نعمانی کا پلڑا بھاری نظر آیا کیوں کہ انہوں نے ایک مؤرخ کی طرح خلیفہ دوم کے تمام حالات وواقعات کو مربوط انداز میں پیش کیا ہے، نیز انہوں نے مستند، بنیادی مآخذ اور قدیم معتبر تاریخ کے ساتھ ساتھ جدید تحقیق کے اصول وضوابط کو پیش نظر رکھا ہے۔ مزید برآں انہوں نے اپنی کتاب میں اہل مغرب بالخصوص مستشرقین کے متعدد اعتراضات کا تسلی بخش جواب دیا ہے، البتہ صاحب کتاب نے اس میں حضرت عمرؓ پر لگائے گئے ایک الزام یعنی اسکندریہ کے کتب خانے کو جلا دینے کا ذکر نہیں کیا ہے، شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس موضوع پر ''کتب خانہ اسکندریہ'' کے عنوان سے پہلے ہی لکھ چکے تھے۔

محمد حسین ہیکل نے علامہ شبلی کی تصنیف کے تقریباً نصف صدی بعد حضرت عمرؓ پر قلم اٹھایا اور اس کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ انہوں نے مستند اور بنیادی مآخذ کے ساتھ ساتھ علامہ شبلی کے برعکس مستشرقین کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا تھا، البتہ ان کا انداز تحریر بطور قصہ نگار ہے، چنانچہ ان کی کتاب میں انفرادی حوالہ جات کی کمی نظر آتی ہے، نیز وہ واقعات کو مربوط اور تسلسل کے ساتھ نہیں پیش کر سکے ہیں، جیسے ایک واقعہ کے متعدد پہلو مختلف جگہوں پر بیان کیے گئے ہیں، جس سے قارئین کو الجھن ہوتی ہے۔ اسی طرح انہوں نے علامہ شبلی کے برعکس ذیلی عناوین بہت کم قائم کیے ہیں، جس کی وجہ سے کسی خاص واقعہ یا مطلوبہ روایات تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ البتہ انہوں نے عہد فاروقی کی

---

[۴۶] الفاروق، صفحات ۲۷۸-۲۷۹

فتوحات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور فاروق اعظم کے ملکی، مذہبی، دینی اور اولیات فاروقی وغیرہ پر بہت کم توجہ دی ہے، جس سے ان کی شخصیت کا ایک بڑا اہم حصہ دب گیا ہے۔

علی محمد محمد الصلابی نے حضرت عمر فاروقؓ پر آج سے تقریباً بیس سال پہلے قلم اٹھایا۔ انہوں نے فاروق اعظمؓ کے حالات و واقعات کو مختلف موضوعات اور ذیلی عناوین کے تحت مربوط اور منظم انداز میں پیش کیا ہے، البتہ بنیادی مآخذ سے زیادہ ثانوی مآخذ پر انحصار کیا ہے، جس کی وجہ سے اس کی استنادی حیثیت دونوں کتابوں سے کم نظر آتی ہے۔ ایک اہم بات جو تینوں مصنفین میں قدر مشترک کے طور پر نظر آتی ہے وہ یہ کہ تینوں مصنفین نے اپنی اپنی کتابوں میں اہل مغرب بالخصوص مستشرقین کے متعدد اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ایک قدیم ترین طالب علم محمد احسان اللہ عباسی چریّاکوٹی کا اردو ترجمہ قرآن

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

سابق صدر شعبۂ علوم اسلامیہ، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

zafarul.islam@gmail.com

وہ اصحابِ علم بلاشبہ قابل قدر اور موجبِ درس ہیں جو قرآن کی سب سے بڑی صفت "ھدی للناس" (جملہ انسانیت کے لیے رہنمائی کا ذریعہ) کے تقاضے پورے کرتے ہوئے روز مرّہ زندگی میں اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، دوسروں کے لیے اس سے فیض یابی کی راہیں ہموار کرتے ہیں اور ارشادِ نبوی ﷺ "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقرآنَ وَعَلَّمَه" (تم میں بہتر وہ ہے جو خود قرآن سیکھے اور اسے [دوسروں کو] سکھائے) کا مصداق بننے کا شرف پاتے ہیں۔ محمد احسان اللہ عباسی چریّاکوٹی (۱۸۶۵ء-۷،مارچ ۱۹۲۸ء) ایسے ہی قابل قدر افراد میں شامل تھے۔ وہ ۱۸۷۵ء میں سر سید کے قائم کردہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے اولین قدیم ترین طالب علموں میں سے تھے۔ یہ راقمِ اپنی تحریروں میں اس حیثیت سے احسان اللہ عباسی مرحوم کا ذکرِ خیر کرتا رہا ہے، لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ انہیں قرآن کریم کے اردو ترجمہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ قبل جب مترجم محترم کی پڑپوتی ڈاکٹر فائزہ عباسی صاحبہ (ڈائرکٹر یو جی سی ہیومن ریسورسز ڈیولپمنٹ سنٹر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی کرم فرمائی سے زیرِ تعارف اردو ترجمہ قرآن کی کاپی موصول ہوئی تو اس کے ابتدائی صفحات پڑھ کر اس واقفیت پر مسرت کی انتہاء نہ رہی کہ فاضل مترجم وہی ہیں جن کا تذکرہ اس عاجز نے سر سید اور ادارۂ سر سید سے متعلق بعض کتب و مضامین میں کیا ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ ۲۴، مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم کے افتتاحی جلسے کے آخر میں بانیِ محترم سر سید احمد خاں نے تین اولین طلبہ (جو اس جلسے میں موجود تھے) کا تعارف صدرِ جلسہ ڈپٹی محمد کریم (محمد آبادی) سے کرایا تھا۔ ان میں ایک طالب علم سر سید کے قریبی رفیق مولوی سمیع اللہ خاں کے صاحب زادے حمید اللہ تھے، باقی دو چریّا کوٹ، اعظم گڑھ کے رہنے والے محمد احسان اللہ عباسی اور محمد ثناء الحق تھے۔ سر سید نے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا تھا: ''مجھ کو نہایت خوشی اور دلی مسرت ہے کہ پہلا طالب علم جو اس مدرسہ میں آیا وہ میر الختِ جگر حمید اللہ ہے اور نہایت مبارک باد دیتا ہوں اپنے جانی

بھائی سمیع اللہ خاں کو۔۔۔۔ بعد اس کے دو غریب لڑکے اعظم گڑھ سے آئے ہیں۔ ان میں ایک لڑکا جس کے والدین نے انتقال کیا ہے اور دوسرا جس کے فضلِ الٰہی سے والدین زندہ ہیں۔ والدین کو جو محبت و شفقت ہوتی ہے اس کے کہنے کی حاجت نہیں، مگر جب انہوں نے سنا کہ مدرسۃ العلوم کھلے گا، اس کے باپ نے فوراً اسے بھیج دیا''[1]۔

اس کے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ اول الذکر یتیم طالب علم سے مراد احسان اللہ ابن عزیز الدین اور موخر الذکر ثناء الحق ابن محمد باقر ہیں[2]۔ اسی ضمن میں یہ وضاحت بھی دلچسپی واہمیت سے خالی نہ ہوگی کہ مدرسۃ العلوم میں داخلہ لینے کے لئے احسان اللہ عباسی کی راہیں کیسے ہموار ہوئیں۔ مدرسۃ العلوم کے افتتاح کا وقت قریب آیا تو سر سید نے اپنے استاد مکرم مولانا عنایت رسول (جن سے انہوں نے عبرانی زبان سیکھی تھی) سے رابطہ قایم کیا اور درخواست کی کہ مدرسۃ العلوم کے لیے کچھ طلبہ بھیجئے، اس کے لیے انہوں نے احسان اللہ عباسی (جو اس وقت ان کے بھائی مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کے زیرِ تعلیم وتربیت تھے) کو منتخب کیا اور اس طرح بفضلہٖ تعالیٰ علامہ شبلی کے استاد کے ایک شاگرد عزیز و یتیم کو مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں داخلہ نصیب ہوا[3]۔

محمد احسان اللہ عباسی (ساکن چریّا کوٹ، اعظم گڑھ) مولانا عنایت رسول چریّا کوٹی اور مولانا فاروق چریّا کوٹی کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں ۱۸۷۵ء سے ۱۸۸۰ء تک زیر تعلیم رہے۔ بعد میں انہوں نے گور کھپور (جہاں ان کے کچھ اہلِ خاندان پہلے سے قیام پذیر تھے) میں سکونت اختیار کی۔ یہیں رہتے ہوئے انہوں نے مختاری اور پھر وکالت کا پرائیویٹ امتحان پاس کیا اور تاحیات اسی پیشہ سے وابستہ رہے۔ وہ علمی ذوق رکھتے تھے اور مطالعہ کتب کے بہت شائق تھے۔ ان کی علمی دلچسپی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ میں طالب علمی ہی کے زمانہ میں انہوں نے چارلز لیمب Charles Lamb کی کتاب Lamb's Tales کا اردو میں ترجمہ ''فسانۂ دل پذیر'' کے عنوان سے کر ڈالا جسے پہلی بار منشی نول کشور نے طبع کرایا اور کالج سے فراغت کے تیسرے سال (۱۸۸۳ء میں)

---

[1] ضمیمہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۰/۲۲،۲۸/مئی ۱۸۷۵ء، ص ۸

[2] ظفر الاسلام اصلاحی، مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا قیام اور اس کے اولین نقوش، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۱۸ء، ص ۵۸۔۵۹

[3] فیروز احمد، احسان اللہ عباسی۔ حیات اور کارنامے، براؤن بکس پبلیکیشنز، علی گڑھ، ۲۰۱۹ء، ص ۲۰، بحوالہ اسد اللہ عباسی، شمیم عشرت، مطبع رفاہ عام، گور کھپور، ۱۹۴۱ء [مقدمہ بعنوان یادِ ایّام]، ص ۱۰

''حکمائے یونان'' نامی کتاب (مصنفہ عبداللہ میدن پوری) کی تلخیص تیار کی جو پہلی بار ۱۸۸۳ء میں طبع ہوئی۔

ان کی علمی دلچسپیاں گوناگوں تھیں اور تحریری صلاحیتیں مختلف میدانوں میں نمایاں ہوئیں۔ ان کی مصنفہ و مترجمہ کتب مختلف موضوعات (قرآن، فقہ، اسلامی قانون، تاریخِ اسلام، اسلامی نظامِ حیات، تذکرہ، فلسفہ، ناول نگاری اور شعر و شاعری) سے تعلق رکھتی ہیں[۴]۔

ان کی علمی یادگاروں میں اردو ترجمہ قرآن (معروف بہ ''قرآن مجید: ترجمہ بزبانِ اردو'') کو بلاشبہ ان کا شاہ کار کہا جاسکتا ہے۔ یہ ترجمہ قرآن پہلی بار ۱۹۱۴ء اور تیسری بار ۱۹۲۱ء میں طبع ہوا تھا (طبع دوم کا سن قطعی طور پر معلوم نہیں ہو سکا)۔ اس ترجمہ قرآن کا چوتھا ایڈیشن محترمہ ڈاکٹر فائزہ عباسی صاحبہ نے بڑے اہتمام سے براؤن بکس، علی گڑھ سے دسمبر ۲۰۲۲ء میں طبع کرایا ہے۔ ۵۸۱ صفحات پر مشتمل یہ جدید ایڈیشن اس لحاظ سے منفرد و ممتاز ہے کہ یہ قرآن کریم کے عربی متن کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اپنے پردادا کی قیمتی علمی میراث کو موجودہ دور کے لوگوں کے لیے لائقِ استفادہ بنا کر ڈاکٹر صاحبہ نے یقیناً ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔

یہ بخوبی معروف ہے کہ ادارۂ سرسید کا قیام خاص طور سے جدید تعلیم کے فروغ اور عصری علوم کی ترویج و اشاعت کے لیے عمل میں آیا تھا، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ دینیات، اسلامی علوم اور مشرقی زبانوں کی تعلیم کا نظم شروع ہی سے اس ادارہ میں قائم رہا ہے، اسی طرح اسلامی علوم کے تحفظ و فروغ کی راہ میں سرگرمی ہر دور میں پائی جاتی رہی ہے۔ واقعہ یہ کہ قرآن و قرآنی علوم اور سیرتِ نبوی ﷺ میں اس ادارہ کے طلبہ، اساتذہ و کارکنان کی دلچسپی اور ان کی خدمت کا سلسلہ اس کے ایّامِ قیام سے ہی جاری ہے۔ اولین دور میں قرآن کریم، سیرتِ نبوی ﷺ اور دیگر علوم کے میدان میں سرسید، علامہ شبلی (پروفیسر عربی و فارسی ایم۔اے۔او کالج)، مولانا حمید الدین فراہی (عہدِ سرسید میں علی گڑھ کالج کے طالب علم اور محسن الملک کے زمانہ میں اسسٹنٹ پروفیسر عربی) اور احسان اللہ عباسی (مدرسۃ العلوم کے ایک قدیم ترین طالب علم) کی خدمات معروف ہیں۔ بانی محترم کے قرآنی مضامین اور ان کی اردو تفسیر القرآن محتاجِ تعارف نہیں، انہی کی ایماء پر علامہ شبلی نے تقریباً ۸ برس تک

---

[۴] احسان اللہ عباسی کی علمی یادگاروں کے تعارف کے لیے ملاحظہ کریں: فیروز احمد، احسان اللہ عباسی۔ حیات اور کارنامے، محولہ بالا، ص ۳۹۔۱۰۱

روزانہ (کلاس شروع ہونے سے قبل) کالج کے طلبہ کو درسِ قرآن دینے کی خدمت انجام دی اور سرسید ہی کی ایماءپر علامہ شبلی نے کالج کی درسیات کے لیے سیرت پر عربی کی مختصر کتاب ''رسالہ بدءالاسلام'' تالیف کی۔ طلبہ کی ضرورت کے تحت اس رسالہ کا فارسی ترجمہ مولانا حمید الدین فراہی کے علی گڑھ میں ایّامِ طالب علمی کی ایک علمی کاوش ہے۔ انہی کے بیان کے مطابق قرآن مجید میں ان کے تدبر و تفکر کا سلسلہ علی گڑھ قیام کے دوران شروع ہوا تھا۔ حقیقت ہے کہ ادارۂ سرسید میں قرآنی علوم و افکار میں دلچسپی اور ان کی اشاعت کی داغ بیل بانی محترم کے عہد میں پڑ چکی تھی، بعد کے دور میں یہ سلسلہ اور بڑھتا رہا۔ ۲۰۱۲ء میں پروفیسر خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن کا قیام اسی راہ میں سرگرمی کی ایک کڑی ہے۔

احسان اللہ عباسی کی تصنیفی و تالیفی کاوشوں (کتب و مضامین) کا تعلق مختلف موضوعات سے رہا ہے۔ ان کی تحریروں کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر کا اصل مقصد معاشرے کی اصلاح تھا۔ ان کا خاص نشانہ مسلم گھرانوں میں پھیلی ہوئی بدعات یا غیر اسلامی رسوم و روایات اور سماج میں پنپ رہی برائیاں تھیں۔ درحقیقت وہ ایک روشن خیال اور وسیع النظر صاحبِ علم، بہت ہی بیدار مغز اور نبّاضِ وقت تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کی معاشرتی صورتِ حال (بالخصوص مسلم معاشرے) کا بہت قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں اور غیر ضروری رسوم و رواج پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ ان سے معاشرے کو نجات دلانے کے لیے ان کے خلاف لوگوں کی ذہن سازی کو وہ بہت ضروری سمجھتے تھے۔ سماجی و معاشرتی خرابیوں اور برائیوں کے خلاف جدوجہد اور برادران اسلام کو ان سے دور رہنے کی دعوت دینے کے لیے انہوں نے قلم کے استعمال اور دل نشیں اسلوبِ نگارش کو زیادہ مفید و موثر تصور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریروں کے ذریعے اپنے درد بھرے احساسات کے اظہار اور اپنے مصلحانہ افکار و خیالات کی اشاعت کی راہ میں وہ تاحیات سرگرداں رہے۔

یہ محسوس کرکے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ وہ محض پانچ، چھ برس (۱۸۷۵ء۔۱۸۸۰ء) مدرسۃ العلوم میں زیرِ تعلیم رہے اور ایک مصلح کی حیثیت سے سرسید کی مقناطیسی شخصیت نے انہیں اپنی طرف پوری طرح کھینچ لیا۔ ان کا اصلاحی مشن اور اس کے دیرپا اثرات ان کے دل و دماغ میں اس طرح رچ بس گئے کہ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ سماجی و معاشرتی اصلاح کے میدان میں سرگرم ہو گئے اور اس مہم کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے انہوں نے اپنی ذہنی و علمی صلاحیتیں وقف کر دیں۔

عباسی صاحب مرحوم کی سوانح اور ان کی علمی، سماجی و ملی خدمات پر ایک مفید کتاب کے مصنف

فیروز احمد نے ان کی شخصیت کے سب سے نمایاں پہلو پر تبصرہ فرمایا ہے: ''احسان اللہ عباسی بنیادی طور پر ایک مصلحِ قوم تھے۔ گرچہ سر سید کی طرح ان کا دائرہ اتنا وسیع نہیں، تاہم ان کی تحریروں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود، ان کی تعلیمی، سماجی، تہذیبی اور معاشی ترقی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ سب ان کی تحریروں، تقریروں اور عملی کاموں میں موجود ہے''[۵]۔

''مسلمانانِ ہند کی حالتِ زار'' کے عنوان سے (۱۰۱ اشعار پر مشتمل) ان کی طویل مثنوی دراصل ادبار و پستی کی شکار پوری ملت کے احوال پر دلی کرب کا اظہار اور اصلاحِ احوال کی ہمدردانہ دعوت ہے۔ بقول مولفِ ''سخن ورانِ اعظم گڑھ'' اس کو پڑھ کر دل میں زندگی کو کامیاب و کامراں بنانے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے اور عہدِ رفتہ کو آواز دینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے[۶]۔ یہ مثنوی مکمل صورت میں مرحوم کی معروف کتاب ''الاسلام'' کے آخری حصہ میں شامل ہے۔ یہ کتاب اب نایاب ہو چکی ہے۔ ''سخن ورانِ اعظم گڑھ'' (حصہ اول) کے مولفِ مولانا قمر الزماں مبارک پوریؒ نے صاحبِ مثنوی کے تذکرے کے آخر میں اس پوری مثنوی کو نقل کر کے موجودہ دور کے اہلِ علم کی اس تک رسائی آسان کر دی ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کی راہ میں تحریروں کے توسط سے احسان اللہ عباسی کی جدوجہد کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ انہوں نے جو کچھ لکھا اس میں دینِ برحق کی تعلیمات کی روح جلوہ گر ہے، قرآن و سنت کے مطالبات کا نچوڑ اس میں آگیا ہے۔ در حقیقت زیرِ تعارف اردو ترجمہ قرآن بھی معاشرے کی اصلاح کے لئے ان کی سرگرمیوں کا ایک بہت ہی اہم حصہ تھا۔ قرآن مجید کے تئیں عام مسلمانوں کے رویے کو دیکھ کر وہ بہت فکر مند تھے کہ انہیں کیسے کتابِ ہدایت سے قریب لایا جائے، کون سی تدبیر اختیار کی جائے کہ وہ قرآن کریم کے پیغام کو سمجھنے کے اہل ہو جائیں اور کم از کم وہ یہ جان لیں کہ روز مرہ زندگی کی بہتری اور ہمیشہ ہمیش کی زندگی میں سکون و آرام نصیب ہونے کے لئے قرآن انہیں کیا سبق سکھاتا ہے۔ قرآن کریم سے تعلق کی مضبوطی اور روز مرہ زندگی میں قرآنی تعلیمات پر عمل آوری کو ہی عباسی صاحب مرحوم اصلاحِ احوال کا سب سے موثر ذریعہ سمجھتے تھے۔ اپنے زمانے میں رائج اردو میں قرآن کا با محاورہ ترجمہ کرنا ان کی

---

[۵] احسان اللہ عباسی۔ حیات اور کارنامے، ص ۳۸

[۶] قمر الزماں مبارک پوری، سخن ورانِ اعظم گڑھ، جعفر لائبریری، مئو، ۲۰۱۵، ص ۱۵۳

اسی فکر مندی کا مظہر اور اصلاحِ احوال کی راہ میں ایک عملی قدم تھا، جیسا کہ ترجمہ کے دیباچہ میں انھوں نے اس ترجمے کا خاص محرک اور اصل مقصد اس طور پر واضح کیا ہے:

اس ترجمہ کرنے کا خیال مجھے اول اول ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ لکھے پڑھے مسلمان بھی جو تلاوت کرتے رہتے ہیں، مضامینِ قرآن سے آخر تک واقف نہیں ہوتے۔ آیاتِ قرآنی کی عظمت تو دلوں میں رکھتے ہیں، لیکن ان کے سمجھنے سے بے بہرہ رہتے ہیں اور ناواقفیت کے باعث کبھی کبھی مضامینِ قرآن سے انکار کرتے ہیں۔ میں نے یہ بھی خیال کیا کہ جب قرآن میں جابجا یہ تذکرہ ہے کہ قرآن عربوں پر ان کی زبان میں اس لیے اترا ہے کہ وہ اسے اچھی طرح سمجھ سکیں (سورہ یوسف: ۱۲، رکوع ۱، سورہ رعد: ۱۳، رکوع ۵) تو ہر ذی علم مسلمان پر یہ فرض کفایہ ہے کہ وہ قرآن پاک کو اپنی زبان میں اپنی قوم کو سمجھائے[۷]۔

اس سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کے ترجمے کا اصل محرک عام پڑھے لکھے لوگوں کے لیے فہمِ قرآن کی راہیں ہموار کرنا تھا تاکہ روزمرّہ زندگی میں اس سے حصولِ رہنمائی میں انہیں آسانی ہو۔

اس ضمن میں یہ ذکر بھی اہمیت رکھتا ہے کہ احسان اللہ عباسی نے ترجمے کے حواشی میں بھی بعض آیات کے حوالے سے غیر عربی زبان میں قرآن کریم کے ترجمے کی ضرورت وافادیت اجاگر کی ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۱۹ (وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْآنُ لِاُنْذِرَ کُمْ بِہٖ وَ مَنْ بَلَغَ) کے ترجمہ "اور مجھ پر اس نے قرآن اتارا ہے کہ اس کے ذریعے میں تمھیں اور جسے اس کی خبر پہنچے، اسے ڈراؤں" کے حاشیہ میں مترجم تحریر کرتے ہیں: "قرآن صرف اصحابِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا باشندگانِ عرب پر نہیں اترا ہے، بلکہ جہاں یہ قرآن پہنچے، سمجھنا چاہئے کہ وہاں پیغمبر بھی حکمِ خدا پہنچانے کو پہنچ گئے۔ عالموں کا کام ہے قرآن کو غیر قوموں تک پہنچا دینا۔ کسی غیر قوم تک قرآن کسی طرح بخوبی نہیں پہنچایا جاسکتا جب تک اس غیر زبان میں اس کا ترجمہ نہ کیا جائے۔ ہر ایک کو خود سمجھ لینا چاہئے کہ مختلف زبانوں میں قرآن کا ترجمہ ہونا کتنا ضروری امر ہے"[۸]۔ اسی طرح سورہ ص کی آیت ۸۷ (اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ) کے ترجمے پر حاشیہ میں اس نکتہ کی جانب توجہ دلائی گئی ہے: "اس سے غیر زبانوں میں قرآن کی اشاعت ضروری ٹھہرتی

---

[۷] محمد احسان اللہ عباسی، قرآن مجید۔ ترجمہ بزبانِ اردو (اس کے بعد کے حوالے بعنوان "ترجمہ قرآن مجید از احسان اللہ عباسی")، براؤن بکس، علی گڑھ، ۲۰۲۲ء [دیباچہ]، ص ۳۲

[۸] ترجمہ قرآن مجید از احسان اللہ عباسی، محولہ بالا، ص ۱۷۲، حاشیہ نمبر ۲

ہے''[۹]۔

مزید براں مترجم نے وقت کی ضرورت کے تحت بامحاورہ اردو ترجمۂ قرآن کی ضرورت وافادیت اس پہلو سے بھی واضح کی ہے کہ اپنے ملک میں پہلے عربی وفارسی کے ایسے اہلِ علم حضرات کی کمی نہ تھی جو قرآن سمجھ کر اس کے معنٰی ومطالب وعظ کی صورت میں لوگوں کے سامنے بیان کر دیا کرتے تھے، لیکن اب صورتِ حال بدل گئی ہے: ''لوگ عربی کیا فارسی زبان سے بھی کنارہ کرتے جاتے ہیں اور وہ وقت قریب ہے کہ قرآن کے سمجھنے والے ہندوستان میں ''النادر کالمعدوم'' کے حکم میں آجائیں گے۔ انہی خیالات نے مجھے بامحاورہ اردو زبان میں ترجمۂ پاک شائع کرنے کی طرف مائل کیا''[۱۰]۔

صاحبِ ترجمہ کو ترجمۂ قرآن عام فہم اور اس سے استفادہ کو آسان بنانے کی کس قدر طلب تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے لئے انہوں نے متعدد تدابیر اختیار کیں: اول یہ کہ مترجمِ محترم نے ترجمۂ قرآن کے شروع میں ایک نہایت قیمتی دیباچہ رقم فرمایا ہے۔ تقریباً ۲۵ صفحات پر مشتمل یہ دیباچہ قدیم الہامی، مذہبی کتب، قرآن کریم کے تعارف، نزول اور جمع وتدوین قرآن، اس کے فیوض و برکات اور اس کے معنی ومفہوم کی تشریح وترجمانی سے متعلق قیمتی مباحث سے معمور ہے۔ دیباچہ کے بعد (طبع قدیم کی ترتیب کے مطابق) ''فہرستِ سورہ ہائے قرآن مجید'' کے تحت ہر سورہ کے ہر رکوع کے اہم مضامین کی فہرست اردو ترجمہ کے متعلقہ صفحہ / صفحات نمبر کے ساتھ مندرج کی گئی ہے۔ نمبر شمار / نام سورہ / صفحہ / رکوع / مضامین کی ترتیب کے مطابق جدول کی صورت میں مرتب ۲۱ صفحات پر مشتمل یہ فہرست، جو ''مضامینِ قرآن مجید ایک نظر میں'' (Subjects of the Holy Quran at A Glance) کی حیثیت رکھتی ہے، بڑی افادیت کی حامل ہے۔

دوسرے یہ کہ آیات کے لفظی ترجمہ کے بجائے فاضل مترجم نے بامحاورہ ترجمہ کرنے کا اہتمام کیا اور خاص طور سے وہ اردو زبان اختیار کی ہے جو ان کے زمانہ میں عام پڑھے لکھے لوگوں میں مروج تھی۔ ترجمے کے دیباچے میں ترجمے کو بامحاورہ بنانے کے لیے اپنی کوشش کا ذکر کرتے ہوئے وہ تحریر کرتے ہیں: ''اصل قرآن کی فصاحت اور بلاغت ترجمہ میں پیدا کرنا مشکل، بلکہ محال ہے، لیکن پھر بھی میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ترجمہ گو لفظی ہو مگر اس وقت کی مستند اردو زبان میں ہو اور بامحاورہ ہو۔ جس

---

[۹] ماخذ سابق، ص ۴۳۵، حاشیہ نمبر۔ ۲

[۱۰] دیباچہ ترجمۂ قرآن از مترجم، ص ۳۳

طرح شاعر تول تول کر الفاظ اپنے اشعار میں رکھتا ہے، اسی طرح میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ترجمہ میں ایسے الفاظ رکھے جائیں جو کانوں کو خوش گوار معلوم ہوں''[۱۱]۔

اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ہر زبان کے رنگ و آہنگ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات کے استعمال میں کچھ نہ کچھ تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اسی ضمن میں زیرِ مطالعہ ترجمے سے متعلق جدید دور کے بعض اسکالرز کا یہ تاثر اہم معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبد القادر دہلویؒ کے ترجمہ (جو ۱۷۹۰ء میں مکمل ہوا تھا) کو سو برس سے زائد گذر جانے کے بعد ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ بامحاورہ اور آسان زبان میں ایک ایسا ترجمہ قرآن وجود میں آئے جو لوگوں کے لیے فہمِ قرآن کو آسان بنائے۔ اس ضرورت کی طرف پہلا قدم مولوی محمد احسان اللہ عباسی نے اٹھایا۔ انہوں نے ترجمہ قرآن کا حصہ اول جو سورۂ فاتحہ و بقرہ پر مشتمل ہے، اسدی پریس، گورکھپور سے شائع کیا۔ یہ پہلا بامحاورہ لیکن نامکمل ترجمہ ہے[۱۲]۔ فاضل مقالہ نگار کے اس بیان (کہ ''یہ نامکمل ترجمہ ہے'') کے تعلق سے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ احسان اللہ عباسی کا ترجمہ قرآن مکمل صورت میں اب تک چار بار شائع ہو چکا ہے۔ اس کے طبع اول کا سن ۱۹۱۴ء ہے اور اس کا جدید ترین چوتھا ایڈیشن ۲۰۲۲ء کے آخر میں براؤن بُکس، علی گڑھ سے اشاعت پذیر ہوا ہے، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔

تیسرے: مترجم نے ترجمے میں احتیاط کا یہ پہلو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے کہ ترجمے میں جو الفاظ (قرآن کے الفاظ سے) زائد استعمال ہوئے ہیں ان کے نیچے خط یا لکیر کھینچ دی ہے اور جہاں توضیحی الفاظ کی ضرورت محسوس ہوئی انہیں بین القوسین (بریکٹ کے اندر) درج کیا ہے۔

احسان اللہ عباسی نے غالباً ترجمے سے عام لوگوں کو جلد فیض یابی کا موقع بہم پہنچانے اور اس سے استفادے میں آسانی کی خاطر اس کی اشاعت کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ مکمل ترجمے کو یک بارگی شائع کرنے کے بجائے مرحلہ وار ڈھائی ڈھائی پارے کا ترجمہ مع متن شائع کرنے کا اہتمام کیا اور یہ اس طور پر کہ ہر صفحہ کے نصف پر قرآن کا عربی متن ہوتا اور اسی کے مقابل دوسرے نصف صفحہ میں اس کا اردو ترجمہ دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ ۱۸۹۲ء سے شروع ہو کر ۱۸۹۴ء تک جاری رہا اور اس طرح ساڑھے سات پارے تک ترجمے کی مرحلہ وار اشاعت انجام پائی۔ یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ترجمۂ

---

[۱۱] دیباچہ ترجمہ قرآن مجید از مترجم، ص ۳۵

[۱۲] ماجد الاسلام، ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ قرآن۔ ایک تعارف، معارف، ۲۱۰/۵، مئی ۲۰۲۳ء، ص ۱۰۔۱۱

قرآن کے سلسلے میں فاضل مترجم کا ارادہ اصلاً پورے قرآن کا ترجمہ ایک ساتھ شائع کرنے کا تھا، لیکن احباب کے اصرار پر پانچ پانچ پارے کے ترجمے کا مجموعہ ایک ساتھ شائع کرنے کا فیصلہ ہوا اور طباعت شروع بھی ہو گئی، لیکن ''الوقت''، مطبع، گور کھپور (جہاں سے یہ ترجمہ چھپ رہا تھا) اپنے کاموں کے انبار (بالخصوص اخبار کی مصروفیات) کی وجہ سے ترجمے کی طباعت میں کافی تاخیر کر رہا تھا۔ مزید تاخیر سے بچنے کے لیے ترجمے کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ڈھائی ڈھائی پارہ کا ترجمہ کی اشاعت کا پروگرام بنا اور اسی کے مطابق مرحلہ وار شائع ہوتا رہا[۱۳]۔ اسی دوران ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶ء۔ ۳ مئی ۱۹۱۲ء) سے ان کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے اردو میں قرآن کا ترجمہ کرنے سے اختلاف ظاہر کیا اور اسے غیر ضرور ی قرار دیا۔ اس کی وجہ سے ترجمہ کا کام موقوف ہو گیا۔ اس واقعے کے تذکرے میں صاحبِ ترجمہ تحریر کرتے ہیں:

> پہلے حصے کے شائع ہونے پر مخالف صدائیں بھی بلند ہوئیں اور موافق رائیں بھی سنی گئیں۔ عوام کا کیا ذکر ہے، خود مولانا نذیر احمد مرحوم دہلوی نے اختلاف کیا اور وہ بھی صورتِ اشاعت سے نہیں، بلکہ نفس ترجمہ سے۔ ۱۸۹۳ء میں مولانا سے اور مجھ سے [اس معاملہ میں] دُوبدُو گفتگو ہوئی اور انہوں نے مجھ سے صاف صاف فرمایا: ''قرآن جب تک عربی زبان میں ہے اس کا لطف ہے، غیر زبان میں اس کی شان قائم نہیں رہ سکتی''۔ گویا کہ ان کے خیال میں قرآن کے جتنے محاسن ہیں وہ صرف فصاحت و بلاغتِ کلام اور ترتیب الفاظ تک محدود ہیں، قرآن کے معنٰی میں کوئی ایسی شئ نہیں کہ اس کا ترجمہ کار آمد خیال کیا جائے[۱۴]۔

صاحبِ ترجمہ کے بیان کے مطابق اس مسئلے پر دونوں میں کافی دیر تک بحث رہی، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس وقت ان کی باتوں کا ڈپٹی نذیر احمد پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ یہاں یہ ذکر بر محل معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد سے عباسی صاحب کے تعلقات علی گڑھ آنے سے پہلے قائم ہو گئے تھے اور قرآن سے متعلق ان سے گفتگو ہوتی رہتی تھی، جیسا کہ ان کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے:

> اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ مولانا (نذیر احمد صاحب) بڑے ادیب تھے، فصاحتِ و بلاغتِ قرآن خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۷۴ء میں میری طالب علمی کا زمانہ تھا، مجھے مولانا سے ملنے کا

---

[۱۳] دیباچہ ترجمہ سورۂ فاتحہ و سورہ بقرہ، حصہ اول، اسدی پریس، گور کھپور، ۱۸۹۲ء

[۱۴] دیباچہ ترجمہ قرآن از مترجم، ص ۳۳

اتفاق ہوتا تھا، تو وہ فرمایا کرتے تھے: ''مجھے کسی کتاب کے پڑھنے میں ایسا لطف نہیں آتا جیسا کہ قرآن کی تلاوت میں آتا ہے، اسی مذاق نے انہیں آخر عمر میں حافظِ قرآن بنا دیا تھا''[۱۵]۔

یہاں واضح رہے کہ ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۶ء اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر کے منصب پر فائز رہے۔ ان کا مشہور ناول ''توبۃ النصوح'' قیامِ اعظم گڑھ کی یادگار ہے۔ اعظم گڑھ سے قبل وہ گورکھ پور میں یہی ذمہ داری انجام دے رہے تھے[۱۶]۔

مترجم کی مصروفیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ قرآن کا سلسلہ موقوف ہو جانے کے باوجود فہمِ قرآن کے فروغ یا کتابِ ہدایت کے معنی و مفہوم تک رسائی آسان بنانے کی فکر ان کے دل و دماغ میں سمائی رہی۔ اس دوران بچوں اور نوجوانوں میں قرآن کی سمجھ پیدا کرنے کی نسبت سے ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ پارہ عمّ زیادہ تر مکاتب میں پڑھایا جاتا ہے، اس کی چھوٹی چھوٹی سورتیں اکثر نماز میں پڑھی جاتی ہیں تو کیوں نہ بچوں و نوجوانوں کے لیے اِن سورتوں کا معنٰی و مفہوم سمجھنے کی راہ ہموار کی جائے۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں انھوں نے عمّ پارہ کا اردو ترجمہ مکمل کر کے اس طور پر شائع کر دیا کہ ایک صفحہ پر عربی عبارت اور دوسرے صفحہ پر اس کا اردو ترجمہ ہوتا تھا[۱۷]۔

اوپر یہ ذکر آ چکا ہے کہ احسان اللہ عباسی اور ڈپٹی نذیر احمد کے مابین اردو ترجمہ قرآن کے مسئلہ پر طویل بحث رہی، اس وقت تو وہ اردو ترجمہ قرآن کی ضرورت و افادیت کے قائل نہ ہو سکے تھے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعد میں اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ انھوں نے قرآن کے اردو ترجمہ کی ضرورت و افادیت تسلیم کر لی، بلکہ خود اس کام کا پختہ ارادہ کر لیا اور اپنا ترجمہ قرآن مکمل کر کے ۱۸۹۶ء میں شائع کرا دیا۔ اس دلچسپ واقعہ کا بیان خود عباسی صاحب کی زبانی ملاحظہ ہو:

> میں نے اس وقت خیال کیا تھا کہ تبادلۂ خیالات سے مولانا پر کوئی اثر نہیں پڑا، لیکن میں نے ۱۸۹۶ء میں بحیرت دیکھا کہ میرے ترجمہ کی اشاعت تین حصوں میں صرف ساڑھے سات پاروں تک پہنچی تھی اور مولانا کا ترجمہ قرآن پورا لوگوں کے ہاتھوں میں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا

---

[۱۵] ماخذ سابق، ص ۳۳

[۱۶] اشفاق احمد، نذیر احمد۔ شخصیت اور کارنامے، مکتبۂ شاہراہ، دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۱۹

[۱۷] دیباچہ ترجمہ قرآن از مترجم، ص ۳۴

ہے کہ میری تقریر کے بعد مولانا نے پھر غور فرما کر ترجمے کی ضرورت تسلیم کی اور پھر بہت سے علماء جمع کر کر کے نہایت اہتمام اور عجلت سے پورا ترجمہ قرآن کا چند سال میں ختم کر دیا"[18]۔

بہر کیف ان واقعات کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عباسی صاحب کے ترجمۂ قرآن کی مرحلہ وار اشاعت کا سلسلہ ایک اور ترجمۂ قرآن یعنی ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن کی تالیف کا موجب بنا، گرچہ یہ الگ مسئلہ ہے کہ ڈپٹی صاحب کا ترجمہ اولین اشاعت سے ہی محلِّ نظر رہا ہے۔ مختلف علماء نے اس پر اعتراضات کیے اور بعض نے ترجمے میں اصلاح طلب مقامات کی طرف توجہ دلانے کے لئے رسالے بھی تحریر کیے۔ ان میں سب سے مشہور مولانا اشرف علی تھانویؒ کا تحریر کردہ "رسالہ اصلاحِ دہلویہ" ہے[19]۔ یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ احسان اللہ عباسی کی ڈپٹی نذیر احمد سے ملاقاتیں، ترجمۂ قرآن کے مسئلہ پر دونوں میں طویل مکالمہ اور اسی کے نتیجہ میں بعد میں اردو ترجمۂ قرآن کی ابتداء و تکمیل اور اس کی اشاعت کے واقعات کا ذکر ڈپٹی صاحب کی حیات و خدمات پر معروف کتب میں کہیں نہیں ملتا۔

احسان اللہ عباسی کا ترجمۂ قرآن (جو ۱۸۹۳ء میں معرضِ التوا میں چلا گیا تھا) کیسے پایۂ تکمیل کو پہنچا؟ اس کی کچھ وضاحت بھی دلچسپی و اہمیت سے خالی نہ ہوگی۔ ترجمے کا کام موقوف ہونے کے بعد بھی ان کے احباب و رفقاء اور شائقینِ قرآن کی جانب سے اس سلسلہ کو جاری رکھنے کا مطالبہ ہوتا رہا، اور ڈپٹی صاحب کے ترجمۂ قرآن کی اشاعت کے بعد اس مطالبے کی آواز اور بلند ہوتی رہی، لیکن وہ دوسری دینی و علمی خدمت تو انجام دیتے رہے، لیکن اس ترجمے کی تکمیل کی نسبت سے پس و پیش میں پڑے رہے، یہاں تک کہ بقول ان کے "اتفاقاً میں ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے جلسے میں بمقام لکھنؤ شریک ہوا۔ وہاں مشاہیر علماء ہندوستان جمع تھے۔ اس وقت سب کے اتفاقِ رائے سے یہ امر قرار پایا کہ ایک ترجمہ قرآن کا بزبان انگریزی ہونا چاہئے جو انگلستان اور امریکا میں اشاعتِ اسلام کا باعث ہو۔ اس پر لوگوں نے اظہارِ مسرت کے ساتھ یہ بھی کہا: بڑا افسوس ہے کہ ہم یوروپ والوں سے کہیں کہ تم ہمارے قرآن پر عمل کرو اور ان سے یہ نہ کہیں [کہہ سکیں؟] کہ قرآن میں کیا لکھا ہوا ہے"[20]۔ عباسی صاحب نے اس پر بڑی حیرت ظاہر کی کہ شرکاء میں سے کسی نے یہ نہ کہا کہ "پہلے ملکی زبان میں ترجمہ شائع کرنا چاہئے،

[18] ماخذ سابق، ص ۳۳

[19] اس موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر ماجد الاسلام کا محولہ بالا مضمون، معارف، مئی ۲۰۲۳ء، ص ۱۶۔ ۲۴

[20] دیباچہ ترجمۂ قرآن از مترجم، ص ۳۴

بعدازاں غیر زبان میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کرنا چاہئے۔ کسی نے یہ صلاح نہ دی کہ اردو، گجراتی، مراٹھی، بنگالی، تلنگی زبانوں میں قرآن پاک کا ترجمہ کرنا اس وقت نہایت ضروری ہے کہ علوم عربی کے اٹھ جانے سے قرآن کی تعلیم ہندوستانیوں کے دلوں سے اٹھتی جاتی ہے۔ ہندوستان کے خاندانی مسلمانوں کو اسلام پر قائم رکھنے کا بندوبست پہلے کرنا چاہئے، پھر اس کے بعد انگریزوں کے پاس ہندوستان سے انگریزی قرآن بھیجنا چاہئے "[21]۔ انگریزی ترجمہ قرآن کی ضرورت وافادیت پر ممتاز علماء کے خیالات سن کر عباسی صاحب نے اسی جلسے کے دوران یہ طے کر لیا تھا کہ چاہے انہیں کتنی ہی عدیم الفرصتی ہو یا اس کی خاطر کتنی محنت کرنی پڑے، وہ اب اپنے بامحاورہ اردو ترجمے کو مکمل کر کے اسے جلد شائع کرنے کی کوشش کریں گے[22]۔

یہاں ندوہ کے مذکورہ اجلاس کی نسبت سے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ صاحب ترجمہ نے اجلاس کا سن ۱۹۱۰ء اور مقامِ انعقاد لکھنؤ تحریر کیا ہے، غالباً اسی بنیاد پر جدید دور کے بعض اسکالرز نے پیشِ نظر ترجمے کی تکمیل اور ندوۃ العلماء کے اجلاس کے ذکر میں یہی تحریر کیا ہے[23]۔ بعض مصنفین کے بیان کے مطابق یہ اجلاس ۱۹۱۲ء میں بمقام لکھنؤ منعقد ہوا تھا[24]۔ روداد اجلاس اور تاریخِ ندوۃ العلماء سے معلوم ہوتا ہے کہ ندوہ کا سالانہ بارہواں اجلاس دہلی میں ۲۶۔۲۸، مارچ ۱۹۱۰ء کو اور تیرہواں اجلاس لکھنؤ میں ۶۔۸، اپریل ۱۹۱۲ء کو منعقد ہوا تھا۔ رودادِ اجلاس سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ انگریزی ترجمہ قرآن کی ضرورت وافادیت پر علماء کا اظہارِ خیال دہلی کے اجلاس (۱۹۱۰ء) میں ہوا تھا اور اسی اجلاس میں انگریزی ترجمہ قرآن سے متعلق تجویز منظور ہوئی تھی جس کے الفاظ یہ تھے: "یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ قرآن شریف کا صحیح اور فصیح انگریزی ترجمہ نہایت خوبی کے ساتھ ندوۃ العلماء کرائے"[25]۔ ندوہ کے ۱۹۱۲ء کے اجلاس (لکھنؤ) میں محض اس تجویز پر عمل درآمد یا اس سے متعلق پیش رفت کی رپورٹ

---

[21] ماخذ سابق، ص ۳۵

[22] ماخذ سابق، ص ۳۵

[23] احسان اللہ عباسی۔ حیات اور کارنامے، ص ۷۵، ۱۱۶، ۱۳۹

[24] ماخذ سابق، ص ۴۱

[25] روداد اجلاس دوازدہم، منعقدہ ۲۶۔۲۸/مارچ ۱۹۱۰ء بمقام دہلی، مطبع احمدی، علی گڑھ، ص ۲۰۵۔۲۰۶

علامہ شبلی نے پیش کی تھی۔[۲۶] ناچیز کے خیال میں کتابت یا پروف ریڈنگ کی غلطی یا تسامح کی وجہ سے ترجمے کے دیباچہ میں "۱۹۱۰ء، بمقامِ دہلی" کے بجائے "۱۹۱۰ء، بمقامِ لکھنؤ" مندرج ہو گیا ہے۔ دوسرے تقریباً دوتہائی قرآن کے ترجمہ کرنے کی ممکنہ مدت پیشِ نظر رہے تو بھی دہلی کے ۱۹۱۰ء کے اجلاس کا حوالہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال اُس وقت کی صورتِ حال میں اردو ترجمہ قرآن کی ضرورت وافادیت اور اس کی تکمیل کی فکر احسان اللہ عباسی کے دل ودماغ میں پوری طرح سرایت کر گئی تھی اور وہ جلد از جلد اس کی اشاعت کے مشتاق تھے، جیسا کہ ان کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے:

> قرآن کا بامحاورہ ترجمہ ایک جداگانہ کتاب کی صورت میں ایسا ضرور مرتب ہونا چاہئے کہ اخبار یا ناول اور تاریخ کی کتابیں پڑھنے کی استعداد رکھنے والے مسلمان ہوں یا غیر مسلمان، بے تکلف اسے پڑھ سکیں اور سمجھ سکیں۔ ہندوستان کی غیر مسلم قوم کو یہ تو معلوم ہو جائے کہ قرآن پاک نے کیا تعلیم دی ہے اور قرآن کی باتیں کہاں تک ماننے کے لائق ہیں اور جو لوگ مسلمان ہیں وہ بھی اسے پڑھ جائیں، عمل کریں یا نہ کریں۔ اتنا تو سمجھ لیں کہ جس قرآن کے وہ پیرو ہیں وہ انہیں کیا کیا باتیں سکھاتا ہے اور کیا کیا احکام سناتا ہے[۲۷]۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترجمہ قرآن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں عباسی صاحب جی جان سے لگ گئے اور ۱۹۱۴ء میں اس کا پہلا ایڈیشن مطبع نور المطابع، لکھنؤ سے قاضی کمپنی، گورکھپور کے زیرِ اہتمام شائع ہو گیا۔ یہاں یہ بات لائق توجہ ہے کہ اکتوبر ۱۹۱۳ء کے پہلے ہفتے میں انہوں نے ترجمے کو مکمل کر کے طباعت کے لیے تیار کر دیا، جیسا کہ دیباچے کے آخر میں مترجم گرامی کے نام کے نیچے مندرج تاریخ ("یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء") سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان سب واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو ترجمہ قرآن کی تالیف کی دلی تمنا کے ساتھ مسلسل کوشاں رہنے والے عباسی صاحب کی ندوۃ العلماء کے اجلاس میں اتفاقیہ شرکت اس نیک وانتہائی مفید کام کی تکمیل کا وسیلہ بن گئی۔

اس ترجمے کے تکمیل کی نسبت سے یہ وضاحت بھی اہم معلوم ہوتی ہے کہ ترجمہ موقوف ہونے کے دوران عباسی صاحب تاریخِ اسلام، اسلامی نظامِ زندگی اور اسلامی قانون جیسے موضوعات پر متعلقہ

---

[۲۶] روداد جلسہ سیز دہم، منعقدہ ۶-۸/ اپریل ۱۹۱۲ء، بمقام لکھنؤ، مسلم پرنٹنگ ہاؤس، امین آباد، لکھنؤ، ص ۵۱-۵۵

[۲۷] دیباچہ ترجمہ قرآن از مترجم، ص ۳۵

لٹریچر کے گہرے مطالعے میں مصروف رہے اور ان موضوعات میں ان کی دلچسپی اس قدر بڑھ گئی کہ خود ان پر کتابیں تصنیف کرنے کی تیاری میں لگ گئے تاکہ اپنے ترجمۂ قرآن کو مزید مفید بنا سکیں اور تشریحی حواشی میں اِن معاون کتب کا حوالہ دے سکیں۔ان کی دو مشہور کتب ''تاریخ الاسلام'' (مطبوعہ ۱۸۹۹ء) اور ''الاسلام'' (۱۹۰۲ء) ترجمۂ قرآن کے موقوف رہنے کے زمانے کی یادگار ہیں۔اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترجمۂ قرآن کے سلسلے کو موقوف کردینا محض ڈپٹی نذیر احمد یا بعض دوسرے اہلِ علم کے نقد و اعتراض کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس میں مزید تیاری کے لیے وقت فارغ کرنے کا بھی دخل رہا ہے، جیسا کہ دیباچے میں انہوں نے ایک جگہ ان الفاظ میں اس کا ذکر بھی کیا ہے: ''اس خیال [ترجمۂ قرآن کو مزید مفید بنانے کی خاطر مزید مطالعہ اور بعض کتب کی تالیف کی ضرورت] نے ترجمۂ قرآن کی اشاعت سے بالکل روک دیا اور میں تاریخ الاسلام لکھنے میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔۱۸۹۹ء میں میری محنت کا نتیجہ ''تاریخ الاسلام'' کے نام سے شائع ہوا''[۲۸]۔

مذکورہ بالا دونوں کتب کی تالیف کا پس منظر یہ ہے کہ ترجمہ کرنے کے دوران انہیں یہ خیال ہوا کہ قرآن کریم کا معنی و مفہوم اچھی طرح سمجھنے کی خاطر گذشتہ انبیاء کرامؑ اور ان کی قوموں (جن کا تذکرہ بار بار قرآن میں آیا ہے) اور خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کرامؓ کے حالات سے واقفیت ضروری ہے۔اس سے فہمِ قرآن کی راہیں مزید کھلتی ہیں اور انبیاء کے واقعات جو قرآن میں اختصار سے بیان ہوئے ہیں انہیں سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ مترجم نے یہ نکتہ ان الفاظ میں واضح کیا ہے: ''قرآن کا پورے طور پر سمجھنا پیغمبرِ خدا کے حالات جاننے پر بہت کچھ منحصر تھا،اس لیے قرآن کا ترجمہ کرتے وقت مجھے کتبِ سیر دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، پھر ان میں کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہوئی کہ آں حضرت ﷺ کے حالات لکھنا شروع کردیے۔ارادہ یہ ہوا کہ ایک مختصر سا رسالہ قرآن کے ترجمے کے ساتھ شائع کیا جائے جو آں حضرت ﷺ کے وقت کے حالات (جہاں تک وہ قرآن میں ہیں) سمجھنے میں معین ہو۔لکھنا شروع کیا تو خلفاءِ اربعہ کے حالات بھی منضبط ہو گئے اور پھر تاریخی مذاق پیدا ہوا تو یہ رائے قائم ہوئی کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے زمانۂ حال کے مسلمانوں تک سلسلہ وار مختصر حالات منضبط کیے جائیں''[۲۹]۔اسی طرح فاضل مترجم کے ذہن میں یہ نکتہ بھی آیا کہ قرآن ایک جامع نظامِ

---

[۲۸] ماخذ سابق، ص ۵۰

[۲۹] دیباچہ ترجمۂ قرآن از مترجم، ص ۵۰

حیات عطا کرتا ہے، اس میں انسانی زندگی کے اصول و ضوابط وضع کیے گئے ہیں۔ ان پر عمل آوری کے فیوض واثرات ماضی میں سامنے آتے رہے ہیں اور اب بھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ قرآنی اصول وضوابط کو اچھی طرح سمجھنا اور مختلف ادوار میں انسانوں اور انسانی سماج پر ان کے اثرات سے واقف ہونا نہ صرف فہمِ قرآن کو تقویت دیتا ہے، بلکہ قرآن کریم کی حقانیت و عجائبات میں لوگوں کے یقین کو مضبوط کرتا ہے اور اس کی ہدایات پر عمل کے فیوض و برکات کو مزید اجاگر کرتا ہے۔

انہی سب خیالات سے انہیں گذشتہ انبیاء کی تاریخ، سیرت نبوی ﷺ، صحابہ کرامؓ کے حالات، مسلم حکومتوں کے مختلف ادوار کی تاریخ اور اسلامی نظامِ حیات اور فقہِ اسلامی پر مبسوط مطالعے کی تحریک پیدا ہوئی اور وہ اس کام میں ایک سنجیدہ طالب علم کی طرح پوری دلچسپی و لگن کے ساتھ مصروف ہوگئے، جیسا کہ عباسی صاحب مرحوم اپنے مطالعے کی داستان ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

> یہاں یہ لکھنا بے موقع نہیں ہے کہ ترجمہ قرآن اور تاریخِ اسلام لکھنے میں مجھے از سر نو طالب علمی کی سی زندگی اختیار کرنا اور محنتِ شاقّہ اٹھانا پڑی۔ سلسلۂ نظامیہ کی تعلیم کا جنہیں تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ صرف و نحو، بیان و معانی، منطق اور فلسفہ کی تحصیل میں سارا وقت طلبہ کا صرف ہو جاتا ہے، دینی کتابیں کم پڑھائی جاتی ہیں۔ علمِ فقہ میں کسی کتاب کی جلدین اولین اور کسی کی جلدین آخرین۔ تفسیر میں جلالین اور تفسیرِ بیضاوی کے کچھ حصے پڑھائے جاتے ہیں اور وہ بھی بے دلی کے ساتھ۔ معقولات کے ساتھ منقولات کی تعلیم ایسی ہی ہوتی ہے جیسے انگریزی تعلیم کے ساتھ عربی یا فارسی کا علمِ ادب دوسری زبانوں کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ معقولات کی تعلیم کے ساتھ منقولات میں کوئی ملکہ حاصل کرنا چاہے تو ایسا کرنے کے لیے استعداد اسے حاصل ہو جاتی ہے، اس سے کام لیا جائے یا نہ لیا جائے۔ میں نے بھی سلسلۂ درسِ نظامی میں تعلیم پائی تھی، لیکن وہ تعلیم مذہبی کتابوں کے لکھنے کے لیے ناکافی تھی۔ مذہبی تالیفات کے لیے مجھے بہت سی کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ اور سیر کی دیکھنا پڑیں، میری عمر کے ۲۳ سال اسی میں صرف ہوئے[۳۰]۔

صاحبِ ترجمہ کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ترجمہ قرآن کریم کی افادیت بڑھانے کی خاطر تاریخِ انبیاء، سیرتِ نبوی ﷺ اور اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار، اسلامی نظامِ حیات اور فقہِ اسلامی پر مطالعے میں گہری دلچسپی اور ان سے متعلق معلومات جمع کرنے کی طلب تھی جو "تاریخ الاسلام" اور "الاسلام"

---

[۳۰] ماخذ سابق، ص ۵۶

جیسی قیمتی تالیفات کے وجود میں آنے کا وسیلہ بنی[۳۱]۔ اس کا ایک ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ترجمہ قرآن کے حواشی میں ان دونوں کتابوں کے بکثرت حوالے دیے گئے ہیں اور بار بار قارئین کو ان سے رجوع کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

پہلی کتاب گذشتہ انبیاء (بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی سرگذشت، ان کی قوموں کے احوال اور نبی آخر الزماں ﷺ کی سیرت کا احاطہ کرنے کے علاوہ خلافتِ راشدہ، بنی امیہ و بنی عباس اور دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف مسلم خاندانوں کی آزاد ریاستوں (بشمول ہندوستان کی دہلی سلطنت و مغل بادشاہت) کی تاریخ سے بھی مختصراً بحث کرتی ہے اور بقول فیروز احمد، ''تاریخ الاسلام'' میں احسان اللہ عباسی نے پوری اسلامی تاریخ کو اجمالی طور پر اور نہایت مربوط انداز میں بیان کیا ہے[۳۲]۔ ترجمہ قرآن سے استفادے کے لیے ایک معاون کتاب کی حیثیت سے موخر الذکر کتاب (الاسلام) کی معنویت و افادیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ اس کے ٹائٹل کور پر یہ تعارفی کلمات مندرج ہیں: ''یہ کتاب اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْناً'' کی تفسیر ہے۔ اس میں ہر پہلو سے اسلام کا نعمتِ خدا ہونا دکھایا گیا ہے، تمام مسائل اسلام بیان کیے گئے ہیں اور ان کی خوبیوں کی توضیح کی گئی ہے۔ معترضین کے جواب بھی بزبانِ شستہ دیے گئے ہیں اور تمام غلط فہمیاں بعنوانِ شائستہ رفع کی گئی ہیں''۔ مزید یہ کہ فاضل مترجم نے ترجمے کے حواشی میں ان دونوں کتابوں کو جو خصوصی اہمیت دی ہے اس پر ان کا یہ تاثر بھی شاہد ہے: ''گویا کہ ''تاریخ الاسلام'' اور ''الاسلام'' کے ساتھ مل کر یہ ترجمہ قرآن کی تفسیر ہو جاتا ہے''[۳۳]۔

ترجمے میں مذکورہ بالا دونوں کتب (تاریخ الاسلام اور الاسلام) کے حوالہ جات کے تعلق سے یہ عرض ہے کہ بیشتر مقامات پر یہ حوالے کتاب کے متعلقہ ''فصل'' کی سرخی اور اس کے نمبر کے تحت دیے گئے ہیں، یعنی کتاب کے متعلقہ صفحہ، صفحات نمبر بہت کم ملتے ہیں۔ اگر ہر مقام پر ''فصل'' کی سرخی اور اس کے نمبر کے ساتھ صفحات نمبر بھی دیے گئے ہوتے تو قاری کو متعلقہ مبحث تلاش کرنے میں آسانی ہوتی۔ کم از کم اہم مباحث کے ضمن میں کتاب کا محولہ حصہ مکمل طور پر یا اس کا خلاصہ نقل

---

[۳۱] مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: احسان اللہ عباسی۔ حیات اور کارنامے، ص ۴۴، ۵۷۔۵۸

[۳۲] ماخذ سابق، ص ۵۷

[۳۳] دیباچہ ترجمہ قرآن مجید از مترجم، ص ۵۰

کر دیا جاتا تو قاری کے لیے مزید باعثِ افادیت ہوتا، خاص طور سے اس صورتِ حال میں جب کہ موجودہ دور میں یہ دونوں کتابیں محض چند لائبریریوں میں دستیاب ہیں، وہ بھی ایسی خستہ حالت میں کہ ان کی ورق گردانی ہی بہت مشکل ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود ان دونوں کتابوں کی تالیف سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ عباسی صاحب (ترجمہ قرآن کا کام موقوف کر دینے کے زمانے میں بھی) اپنے زیر تکمیل ترجمے کی افادیت بڑھانے یا اس سے استفادے کی راہیں مزید ہموار کرنے کی نسبت سے کچھ نہ کچھ سوچتے اور کرتے رہے۔ بلاشبہ قرآن کریم کے اردو ترجمے اور اس کے توسط سے قرآن کا پیغام عام کرنے میں مترجم کی اس غیر معمولی دلچسپی و لگن سے بڑا قیمتی پیغام ملتا ہے۔

ترجمے کے لیے تیاری کے تعلق سے یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ صاحبِ ترجمہ نے تفاسیر یا متعلقہ لٹریچر کے مطالعے میں بھی بڑے انہماک کا ثبوت دیا، یعنی ضروری، معاون و مفید کتب کے مطالعے میں انہوں نے کوئی کسر باقی نہ رکھ چھوڑی۔ ظاہر ہے کہ کلامِ الٰہی کے ترجمے کے لیے خصوصی اہتمام کا یہی تقاضا تھا۔ تفسیری کتب سے استفادہ کے متعلق خود ان کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

> میں نے شروع شروع جب ۱۹۰۰ء (؟) میں ترجمے کا آغاز کیا تھا تو میرے سامنے شیخ سعدی، مولانا رفیع الدین، شاہ ولی اللہ، شاہ عبد القادر اور تفسیر حسینی کے فارسی و اردو ترجمے پیشِ نظر تھے اور کشاف، بیضاوی، تفسیر کبیر، تفسیر جلالین جیسی مستند کتابیں حلِّ لغات اور فہمِ معانی کے لیے میرے سامنے تھیں۔ اس جدید اشاعت کے وقت مولانا نذیر احمد دہلوی اور مولوی فتح صاحب تائب لکھنوی کے ترجمے بھی میں نے پیشِ نظر رکھے[۳۴]۔

واقعہ یہ کہ ترجمے کے متن میں بہت سے مقامات پر کسی آیت کا ترجمہ دینے کے بعد حاشیے میں اسی کے متبادل یا دیگر پسندیدہ (ایک نہیں، دو دو، تین تین) ترجموں کا نقل کرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مترجم کے پیشِ نظر اس وقت کے متداول بیشتر اردو تراجمِ قرآن رہے ہیں۔ مزید برآں اپنے ترجمہ اور اس کے حواشی کے مآخذ کے ذکر میں مترجم نے ایک اصولی بات کی طرف توجہ دلائی ہے جس میں ہر محقق و مصنف کے لیے بڑا قیمتی سبق مضمر ہے، اور وہ یہ کہ: ''جب کوئی شخص کسی امر میں ترقی کرنا چاہے تو اسے لازم ہے کہ اپنے آپ کو اس انتہائے معلومات تک پہنچائے جہاں تک لوگ اس سے پہلے

---

[۳۴] ماخذ سابق، ص ۳۵

پہنچ چکے ہیں اور پھر اس کے بعد اپنی رائے سے جتنا چاہے ان معلومات پر مستزاد کرے"[۳۵]۔ یعنی کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے یا دادِ تحقیق دینے والوں کے لیے ضروری ہے کہ زیرِ بحث موضوع پر دستیاب لٹریچر کا پہلے اچھی طرح مطالعہ کرکے اپنی معلومات کے خزانہ کو پُر کرلیں، پھر اس پر اپنی طرف سے جو کچھ چاہیں اضافہ کریں۔

اپنے ترجمہ قرآن کی افادیت بڑھانے اور قارئین کے لیے اس سے استفادے کو آسان بنانے کے لیے احسان اللہ عباسی نے جو تدابیر اختیار کی تھیں ان میں حواشی کی صورت میں تشریحی و توضیحی نوٹس بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی وجہ سے ترجمے سے استفادہ اور آیاتِ مبارکہ کے معنی و مفہوم اور مطالبات کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ حواشی میں متنِ ترجمہ سے متعلق جو امور واضح کیے گئے ہیں یا جن مشکل مسائل کی تشریح پر خاص توجہ دی گئی ہے، ان میں کچھ اہم یہ ہیں: ترجمے کے متن میں دی گئی کسی آیت کے ترجمے کے علاوہ دوسرے متبادل یا پسندیدہ ترجمے نقل کرنا، آیات میں مذکور اشخاص، اقوام، مقامات، اصطلاحات کی تشریح، آیت سے ماخوذ فقہی مسئلے کی وضاحت اور فقہاء کی اختلافی رایوں کا ذکر، زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق قرآنی ہدایات پر عمل کے فیوض و برکات کا بیان اور ان کی خلاف ورزی کے برے نتائج سے آگاہی، قرآنی تعلیمات پر عمل کے تعلق سے اپنے زمانے کے مسلمانوں کی صورتِ حال کی عکاسی اور اصلاحِ حال کی دعوت۔ واقعہ یہ کہ حواشی کی توضیحات اور ان کے مشتملات کی وسعت نے ترجمے کی قدر و قیمت کو دوبالا کر دیا ہے۔ ان کی نوعیت و جامعیت اور افادیت کے حوالے سے بعض جدید اسکالرز کا یہ تبصرہ صحیح معلوم ہوتا ہے: "یہ ترجمہ خود نصف تفسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔"[۳۶]

ترجمے میں شروع سے آخر تک حواشی کے اہتمام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ زیادہ تر صفحات حواشی سے مزین ہیں۔ متعدد صفحات میں ۷، ۸ سے زائد حواشی ملتے ہیں۔ حواشی غالباً ضرورت کے مطابق یا موقع و محل کی رعایت سے مختصر، بہت مختصر، متوسط اور طویل (بعض ایک سطری، بعض نصف سطر سے بھی کم اور بعض چوتھائی صفحہ سے زیادہ) مختلف صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں کچھ حواشی کے مندرجات مع ترجمہ متعلقہ آیات نقل کیے جا رہے ہیں، ان سے عباسی صاحب کے

---

[۳۵] ماخذ سابق، ص ۳۵

[۳۶] احسان اللہ عباسی۔ حیات اور کارنامے، ص ۴۹

بامحاورہ ترجمہ کی خصوصیت اور حواشی کی تشریحات کی نوعیت سمجھنے میں مدد ملے گی:

سورۃ الحج، آیت-۱۱ (وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْبُدُ اللهَ عَلَى حَرْفٍ) کے اردو ترجمہ ''آدمیوں میں بعض ایسا بھی ہے جو اللہ کی عبادت بے اطمینانی سے کرتا ہے'' میں ''بے اطمینانی'' پر حاشیہ میں یہ واضح کیا گیا ہے: ''عَلٰی حَرْفٍ'' کا ترجمہ ''بے اطمینانی'' سے، بعض نے ''اکھڑا اکھڑا''، بعض نے ''ایک کنارے پر''، بعض نے ''ایک غرض پر'' کیا ہے[۳۷]۔

سورۃ الحاقۃ، آیت-۲۹ (هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ) کے ترجمہ ''میری دلیلیں بے کار ہو گئیں'' پر حاشیہ میں اس کا ایک اور ترجمہ اس طور پر نقل کیا گیا ہے: ''یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے: ''میری بادشاہت بھی لُٹ گئی''[۳۸]۔

سورۃ النساء، آیت نمبر-۱۰۰ (وَمَن يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَماً كَثِيْراً وَسَعَةً) کے ترجمہ ''جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا اسے ملک میں وافر و کشادہ جگہ ملے گی'' کے آخری حصہ کو حاشیہ میں اس طرح واضح کیا گیا ہے: ''یہ ہجرت ہی کرنے والے مسلمان تھے جن کو اللہ نے ہجرت کے تیئسویں برس کے اندر اندر تمام روئے زمین کا حکمراں بنا دیا، اس طرح کہ ایشیائے مغربی اور افریقہ شمالی میں ان کی حکومت تھی، یورپ میں ان کا اثر تھا، مشرقی ایشیاء میں ان کی دھاک تھی۔ دیکھو تاریخ الاسلام، طبع ۲، ص ۲۶۹''[۳۹]۔

سورۂ یوسف، آیت-۹۹ (فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ اٰوٰى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ) کے ترجمہ ''پس جب وہ لوگ [حضرت یوسفؑ کے گھر والے] یوسف کے پاس آئے تو یوسف نے اپنے والدین کو اپنے پاس جگہ دی'' میں ''والدین'' پر حاشیہ میں مترجم رقم طراز ہیں: ''بعض مفسروں نے لکھا ہے کہ حضرت یوسف کی ماں زندہ نہ تھیں، بعض نے کہا ہے کہ ماں سے مراد یہاں خالہ ہے اور باپ تو حضرت یعقوب تھے ہی''[۴۰]۔

سورۃ البقرۃ، آیت-۸۷ (وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَاَيَّدْنَاهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ)[''ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو نشانیاں دی تھیں اور روح القدس سے اس کی مدد کی تھی''] میں ''روح القدس'' کو حاشیہ میں

---

[۳۷] ترجمہ قرآن مجید از احسان اللہ عباسی، ص ۳۳۶، حاشیہ نمبر-۱
[۳۸] ماخذ سابق، ص ۵۳۶، حاشیہ نمبر-۱
[۳۹] ماخذ سابق، ص ۱۴۱، حاشیہ نمبر-۲
[۴۰] ماخذ سابق، ص ۲۶۷، حاشیہ نمبر-۱

اس طور پر واضح کیا گیا ہے: ”روح القدس سے مراد جبرئیل، اسمِ اعظم یا انجیل ہے اور بعضوں نے کہا روح القدس سے مراد روح اللہ ہے، یعنی اللہ کے زندہ کیے ہوئے۔ یہ اضافہ تشریفی ہے، یعنی بغیر واسطے کے اللہ نے انہیں پیدا کیا“[۴۱]۔

سورۂ لقمان کی ابتداء میں سورہ کے نام (لقمان) پر حاشیہ میں ان سے متعلق مختلف اقوال نقل کیے گئے ہیں: ”بعض ان کو پیغمبر کہتے ہیں اور بعض ان کا درجہ صلحاء میں قائم کرتے ہیں اور بعض انہیں باعتبار نسل حضرت ابراہیمؑ کے باپ کی اولاد میں بتاتے ہیں اور بعض حضرت ایّوبؑ کا رشتے دار کہتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ غلام سیہ فام بہت معزز تھے اور کسی نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل کے قاضی تھے“[۴۲]۔

سورۃ النساء آیت ۔۵۹ (یَاَیُّہَا الَّذِین آمَنُوآ اَطِیعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُولَ و اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ)[”اے ایمان والو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور جو تم میں اختیار والے [اولی الامر] ہیں ان کا حکم مانو“] میں ”اختیار والے“ یا ”اولی الامر“ سے کون لوگ مراد ہیں؟ اسے مترجم نے حاشیے میں اس طور پر واضح کیا ہے: ”اولی الامر“ کا ترجمہ ”اختیار والا“ کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین ”سلاطین“ سمجھتے ہیں اور بعض مفسرین کے نزدیک ہر ایک کا افسرِ بالادست اس کا اولی الامر ہے۔ انتظامِ عالم قائم رکھنے کے لیے بھی یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پھر آگے چل کر یہ لکھا ہے کہ اگر حاکم اور محکوم کسی امر میں اختلاف کریں تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اولی الامر کی اطاعت ناواجب بات میں نہ کرنا چاہیے“[۴۳]۔

سورۃ الکہف آیت ۔۹ (اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحَابَ الْکَہْفِ وَ الرَّ قِیْمِ کَانُوا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَباً)[اے محمد ﷺ ”کیا تو سمجھتا ہے کہ اصحاب کہف و رقیم ہماری اور نشانیوں میں سے زائد تر تعجب خیز تھے“] کے لفظ ”رقیم“ پر حاشیہ میں مذکور ہے: ”بعضوں نے لکھا ہے کہ رقیم سے وہ کتبہ مراد ہے جو اصحابِ کہف کے غار پر بطور یادگار قائم کیا گیا تھا اور کہف کے معنی ہیں درّۂ کوہ“[۴۴]۔

سورۃ البقرۃ آیت ۔۱۹۸ (فَاِذا اَفَضْتُمْ مِنْ عَرفَاتٍ فَاذْکُروا اللّٰہَ عِنْدَالْمَشْعَرِ الْحَرَامِ) میں لفظ ”عرفات“ کی

---

[۴۱] ماخذ سابق، ص ۷۰، حاشیہ نمبر ۔۳
[۴۲] ماخذ سابق، ص ۳۹۶، حاشیہ نمبر ۔۱
[۴۳] ماخذ سابق، ص ۱۳۵، حاشیہ نمبر ۔۱
[۴۴] ماخذ سابق، ص ۳۰۳، حاشیہ نمبر ۔۵

وضاحت میں یہ تحریر کیا گیا ہے: ''ایک مقام ہے قریب مکہ کے۔ وجہِ تسمیہ یہ ہے کہ آدمؑ و حواؑ میں تعارف ہونا اسی مقام پر مشہور ہے''، اور ''المشعر الحرام'' کی تشریح میں یہ مرقوم ہے: ''عرفات اور منیٰ کے درمیان ایک مقام ہے، اسے مزدلفہ بھی کہتے ہیں''[۴۵]۔

سورۃ النمل، آیت۔ ۲۲ (وَجِئْتُکَ بِسَبَإٍ بِنَبَإٍ یَقِیْنٍ) کے ترجمہ ''اور ملکِ سبا سے ایک سچی خبر لایا ہوں'' کے حاشیہ میں لفظ ''سبا'' کے بارے میں یہ وضاحت ملتی ہے: ''اس زمانہ میں ملک یمن کا یہ پایہ تخت تھا''[۴۶]۔

سورہ بنی اسرائیل، آیت۔ ۴۱ (وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِی ھٰذا الْقُرْآنِ لِیَذَّکَّرُوا وَمَا یَزِیْدُ ھُمْ اِلَّا نُفُوْراً) کے ترجمہ ''اس قرآن میں ہم نے طرح طرح سے [ان لوگوں کو] سمجھایا کہ یہ نصیحت پکڑیں، مگر اس سے ان کی نفرت بڑھتی ہی گئی'' کا مرادی مفہوم حاشیہ میں یہ بیان کیا گیا ہے: ''ماحصل یہ ہے کہ نااہل کو قرآن سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا''[۴۷]۔

سورۃ النحل، آیت۔ ۱۲ (فَکَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللہِ فاصَابَہَا اللہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا کَانُوایَصْنَعُوْنَ) کے ترجمہ ''پھر انہوں [بستی والوں] نے اللہ کی نعمتوں سے کفر کیا تو اللہ نے انہیں بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا، یہ ان کے فعل کی سزا تھی'' میں وارد لفظ ''بھوک'' پر حاشیہ میں صاحبِ ترجمہ تحریر فرماتے ہیں: ''اہلِ مکہ کی طرف اشارہ ہے۔ ابتدائے رسالت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سات برس تک مکہ میں قحط پڑا''[۴۸]۔

سورۃ الفرقان، آیت۔ ۱۴ (لَا تَدْعُواالْیَوْمَ ثُبُوْراً وَاحِداً وَادْعُوا ثُبُوْراً کَثِیْراً) کے ترجمہ ''[فرشتے کہیں گے] آج ایک موت کو نہ پکارو، بلکہ بہت سی موتوں کو پکارو'' میں ''بہت سی موتوں'' کو حاشیہ میں ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے: ''جب شدّتِ حرارت سے [جہنمیوں کی] تمام بدن کی کھال گر پڑے گی تو پھر سے نئی کھال پیدا ہو گی اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ تو گویا کئی مرتبہ دوزخ میں مرنا اور جینا ہوا۔ جب دوزخی کہیں گے کہ موت آتی تو اچھا ہوتا تو فرشتے بولیں گے کہ موت نہیں کئی موتیں تمہیں ہوں گی، لیکن عذاب سے چھٹکارا نہ ہو گا''[۴۹]۔

---

[۴۵] ماخذ سابق، ص ۸۵، حاشیہ نمبر۔ ۱، ۲

[۴۶] ماخذ سابق، ص ۲۷۳، حاشیہ نمبر۔ ۱

[۴۷] ماخذ سابق، ص ۲۹۷، حاشیہ نمبر۔ ۴

[۴۸] ماخذ سابق، ص ۲۹۳، حاشیہ نمبر۔ ۱

[۴۹] ماخذ سابق، ص ۳۵۷، حاشیہ نمبر۔ ۲

سورۃ المائدۃ، آیت ۔۶ (یَاَیُّہا الَّذین آمَنُوا اِذا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوا وَجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوابِرُءُ وْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ)[''ایمان والو! جب تم نماز کے لیے آمادہ ہو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لو، سروں کا مسح کر ڈالو اور ٹخنوں تک اپنے پانوں کو دھو ڈالو''] کے ترجمہ میں ''پانوں کو دھو ڈالو'' پر حاشیہ میں مترجمِ گرامی نے اس سے متعلق یہ فقہی مسئلہ بیان کیا ہے: ''اہلِ سنت و جماعت پانوں کے بعد ''دھوڈالو'' کا لفظ مقدر مان کر، یعنی سابق دھوڈالو سے متعلق سمجھ کر پاؤں دھونا لازم سمجھتے ہیں اور پیغمبرِ خدا اور خلفائے ثلاثہ کے فعل سے سند پکڑتے ہیں۔ اور اہلِ تشیع کہتے ہیں کہ سر کی طرح پانوں کا مسح بھی جائز ہے اور حضرت علیؓ کے فعل کو سند میں پیش کرتے ہیں، یہاں اہلِ سنت و جماعت کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔ اہلِ تشیع کے مطابق ترجمہ ہو گا: سروں کو اور ٹخنے تک پانوں کو مسح کر ڈالو۔ یہ اختلاف لغوی ترکیب کے اختلاف پر مبنی ہے، اہلِ تشیع ''اَرْجُلِکُمْ'' کی لام کو بالکسر پڑھتے ہیں اور سُنیّ بالفتح پڑھتے ہیں۔ اس نیم غسل کو وضو کہتے ہیں۔ مصالحِ وضو کے لیے دیکھو: الاسلام ہ ف ۲۶''[50]۔

سورۃ المائدۃ، آیت ۔۳۸ (والسَارِقُ والسَارِقَۃُ فَاقْطَعُوااَیْدِیَہُمَا جَزَآءً بِمَا کَسَبَا نَکَالاً مِّنَ اللہ) میں سزا کے طور چوری کرنے والے مرد و عورت کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔ اس سے متعلق ایک فقہی مسئلہ یہ ہے کہ کتنے مال کی چوری پر یہ سزا نافذ ہو گی؟ حاشیہ میں اس کی یہ وضاحت ملتی ہے: ''ابو حنیفہؒ کے نزدیک دس درہم چاندی سے کم کے چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے اور تعمیلِ سزا میں بھی اختلاف ہے۔ حنفیوں کے نزدیک پہلی چوری میں داہنا ہاتھ اور دوسری میں بایاں پانو کاٹا جائے گا، تیسری مرتبہ بھی یہی حرکت کرے تو قید کی سزا ہے اور شافعیوں کے نزدیک جب تک دونوں ہاتھ اور دونوں پانو کٹ نہ جائیں گے سلسلہ قائم رہے گا۔ دیکھو الاسلام، فصل ۔۲۰''[51]۔

سورہ بنی اسرائیل، آیت ۔۱۱۰ (قُلِ ادْعُوا اللہَ اَوِدْعُو االرَّحمن اَیًا مَّا تَدْعُوا فَلَہٗ الاَسْمَاء الْحُسْنَی)[اے محمد ﷺ] ''تم ان لوگوں سے کہو: اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو، جس طرح چاہے پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں'' کے شانِ نزول کے بیان میں صاحبِ ترجمہ نے حاشیہ میں یہ تحریر کیا ہے: ''آنحضرت ﷺ ایک دن ذوق و شوق میں بار بار یااللہ یا رحمن کہتے تھے۔ ابو جہل کہنے لگا ہم کو تو منع کرتے ہیں اور خود دو معبودوں کو پکارتے ہیں۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ قرآن اور حدیثوں سے اللہ کے ننانوے نام

---

[50] ماخذ سابق، ص ۱۵۳، حاشیہ نمبر ۔۱

[51] ماخذ سابق، ص ۱۵۷، حاشیہ نمبر ۔۶

باعتبار اس کی صفات کے ثابت ہوتے ہیں"[52]۔

سورۃ الحجرات،آیت۔ا (يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ)[**"اے مومنو! اللہ اور اس کے** رسول کے سامنے] کلام میں) سبقت نہ کرو"] کا شانِ نزول حاشیہ میں اس طور پر واضح کیا گیا ہے: "قبیلہ بنی تمیم کے کچھ لوگ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملنے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکان کے باہر سے باآوازِ بلند نام لے کر پکارنے لگے، اس وقت یہ ادب بتایا گیا"[53]۔

ترجمہ کے بعض حواشی کے مندرجات سے مترجمِ گرامی کے فکری رجحانات کا ایک اہم پہلو سامنے آتا ہے، اس کی طرف توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ قرآنی افکار و تعلیمات کی اثر انگیزی تھی کہ فاضل مترجم ہر معاملے میں عقل کی بالادستی کے خلاف تھے۔ وہ اس فکر کے حامل تھے کہ عقلِ انسانی ہر چیز کا احاطہ نہیں کر سکتی، بالخصوص ملأ اعلیٰ یا عالم بالا کی چیزوں کی اصلیت یا ماہیت معلوم کرنے کے لیے وہ عقل کے استعمال یا ذہنی مشق کو پسند نہیں کرتے تھے۔ سورۃ الحجر کی آیت ۱۸ (جس میں شہابِ مبین کا ذکر ہے) کی تشریح میں انہوں نے حاشیہ میں بہت صاف صاف لکھا ہے کہ "انسان عالمِ مادّیات میں جتنا ہی غور کرے، بہتر ہے، لیکن عالمِ بالا سے متعلق رائے زنی کارِ شیطانی ہے"[54]۔ سورۃ الاحقاف کی آیت ۲۹ (جس میں جنوں کے قرآن سننے کا بیان ہے) پر حاشیہ میں صاحبِ ترجمہ تحریر کرتے ہیں: "جو یہ کہتے ہیں کہ "جن" کی کیا تعریف ہے وہ اپنی تسکینِ خاطر کے لیے "الاسلام" فصل۔۵۴ دیکھ سکتے ہیں، مگر اس قسم کے شکوک ناقصین کے دل میں پیدا ہوں گے۔ کاملین کے دل میں پیدا نہ ہوں گے۔ جو جتنا ہی جانتا ہے اتنا ہی سمجھتا ہے کہ کارخانۂ قدرت کا راز احاطۂ عقلِ انسانی سے باہر ہے"[55]۔ اسی طرح ان کا خیال تھا کہ قرآن میں جہاں نام کی وضاحت کے بغیر بعض افراد کا ذکر ہے، ان کے نام و مقام کا پتہ لگانا یا ان کے بارے میں چھان بین غیر ضروری امر ہے۔ آیت میں مذکور شخص، اشخاص کے نام سے واقفیت کے بغیر متعلقہ آیات کا مطلب سمجھا جاسکتا ہے[56]۔ مزید یہ کہ قرآن کی جو باتیں انسانی سمجھ

---

[52] ماخذ سابق، ص ۳۰۲، حاشیہ نمبر۔ ۶

[53] ماخذ سابق، ص ۴۸۳، حاشیہ نمبر۔ ۲

[54] ماخذ سابق، ص ۲۸۰، حاشیہ نمبر۔ ا

[55] ماخذ سابق، ص ۴۷۴، حاشیہ نمبر۔ ۴

[56] ماخذ سابق، ص ۴۲۱، حاشیہ نمبر۔ ا

سے باہر کی ہیں ان کے بارے میں عباسی صاحب کا واضح موقف یہ تھا کہ ''پکے مومن کا یہ کام ہے کہ ان پر اس لیے ایمان لائے وہ قرآن میں ہیں''۵۷۔ ان بیانات سے یہ معلوم ہوا کہ فاضل مترجم عقل کی پہنچ کو محدود سمجھتے تھے اور یہ خیال رکھتے تھے کہ عقل انسانی ہر چیز پر حاوی نہیں ہو سکتی، نہ ہر سوال کا جواب دے سکتی ہے، لہٰذا ہر مسئلے میں عقل کا استعمال لاحاصل یا بے سود ہو گا۔ قرآن نے جو کچھ بیان کر دیا ہے اسے بلا چوں چرا مان لینا چاہئے۔ جو چیزیں انسان کی سمجھ سے باہر ہیں ان میں بحث و مباحثہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

ان سب کے علاوہ اس ترجمے کا ایک اور اہم پہلو مختلف مقامات پر (بالخصوص دیباچے میں) قرآنی ہدایات اور تعلیمات پر عمل کے فیوض و برکات اجاگر کرنا اور مثالیں دے کر اہلِ اسلام کے قلوب میں یہ نکتہ جاگزیں کرنا ہے کہ جب تک وہ صدقِ دل سے روز مرّہ زندگی میں قرآن پر عمل کرتے رہے دنیا کی قیادت یا سیادت ان کے ہاتھوں میں رہی، اور جب وہ اس کے پیغام سے غافل ہو گئے اور اپنی عملی زندگی میں اس کے مطالبات پورا کرنے سے قاصر رہے تو ادبار و تنزلی کا شکار ہو گئے۔ مترجمِ محترم نے مختلف پیرایے میں اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ یہاں ترجمے کے دیباچے سے ایک اقتباس کا نقل کرنا کافی ہو گا: ''آخر کار برسوں کے غور و فکر کے بعد میری رائے قائم ہوئی کہ مسلمان جب تک قرآن پر عمل کرتے رہے تب تک دنیا کے پیشوا بنے رہے۔ جب احکامِ قرآن سے الگ ہو گئے تو اپنی پیشوائی کو کھو بیٹھے۔ دوسری قوموں نے ان کے گذشتہ طریقوں پر عمل کرنا شروع کیا۔ اس طرح ان کے اعمال احکامِ قرآنی کے مطابق ہو گئے تو دنیا کی پیشوائی بھی ان کی طرف منتقل ہو گئی''۵۸۔ قرآن کریم پر عمل کے تعلق سے احسان اللہ عباسی کی یہ فکرمندی اور جملہ اہلِ اسلام کے نام ان کے اس پیغام کی اہمیت سمجھنے کے لیے یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ انہوں نے یہی پیغام عام کرنے کے لیے اردو ترجمہ قرآن کی خدمت انجام دی تھی۔ اسے محض ایک علمی مشغلہ کے طور پر نہیں اختیار کیا تھا، بلکہ اس نیک جذبہ کے ساتھ انہوں نے یہ کام کیا تھا کہ اردو جاننے والے عام لوگ کتابِ ہدایت کو سمجھنے اور اس سے طلبِ رہنمائی کے لیے اس ترجمے کو پڑھیں گے اور اس کے توسط سے قرآن کریم کے پیغام و احکام کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر گھر میں چھوٹے بڑے اس ترجمے کو پڑھیں۔ اگر کسی گھر میں سب لوگ

---

۵۷ دیباچہ ترجمہ قرآن مجید از مترجم، ص ۳۸

۵۸ ماخذ سابق، ص ۵۰

اسے نہیں پڑھ سکتے تو جو بھی اس کی استعداد رکھتے ہوں وہ گھر کے لوگوں کے سامنے اسے پڑھ کر سنائیں تاکہ روزمرہ زندگی کے معاملات میں اس سے رہنمائی حاصل کرنے میں سب کو آسانی ہو۔ اس ترجمے کی اشاعت کے بعد وہ یہ بھی توقع رکھتے تھے کہ جو لڑکے لڑکیاں جدید تعلیم کے حصول میں مصروف ہیں وہ اس ترجمے کو پڑھ کر یا سن کر کم از کم دین کی ضروری باتوں سے واقف ہو جائیں گے۔

یہ بخوبی معروف ہے کہ گھر کے بچوں، بچیوں کی تعلیم و تربیت میں خواتین کا بہت اہم (بلکہ کلیدی) کردار ہوتا ہے۔ قابل توجہ بات یہ کہ صاحبِ ترجمہ نے قرآنی ہدایات و تعلیمات کی روشنی میں گھر کے لوگوں کی اصلاح کے مقصد سے خاص طور سے عورتوں کے لیے اس ترجمے کا پڑھنا لازم قرار دینے کی تجویز پیش کی تھی:

> ایک صورت میں اور پیش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ شرفاء اپنی عورتوں کے لئے اس ترجمہ کا پڑھنا لازم کر دیں تو ان کے ذریعہ سے گھر کے تمام لڑکے لڑکیاں اسے پڑھ لیں گی اور اس نئے زمانے میں جب کہ دینی تعلیم سے بے پروائی بڑھتی جاتی ہے یہ بہترین طریقہ مسلمانوں کے گھروں میں مذہبی تعلیم قایم رکھنے کا ہوگا۔[۵۹]

اس ترجمے کے توسط سے قرآن کریم کے معنی و مفہوم تک رسائی کو آسان بنانا اور اللہ کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے کی راہیں ہموار کرنے کی خاطر اس ترجمے کی اشاعت کو مزید مستند و مفید بنانے کے لیے مترجم نے دیباچے کے آخری حصے میں علماءِ کرام کی خدمت میں جو عرض داشت پیش کی ہے وہ بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے: ''میں تو یہ درخواست کرتا ہوں کہ ترجمے کی یہ صورت جو میں نے اختیار کی ہے، اگر علماء اسے پسند فرمائیں تو ہندوستان کے کسی مقام پر ایک مجلس قائم کریں اور پھر اسی مجلس سے اس ترجمے کی اشاعت ہوتی رہے۔ حقِّ ترجمہ کسی کی ذاتی ملکیت نہ رہے۔ اس طرح جس ترجمے کی اشاعت ہوگی وہ ہندوستان کے لیے مستند ہوگا''[۶۰]۔

آخر میں زیرِ تعارف ترجمے کی طباعت کے تعلق سے یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کے اولین تین ایڈیشن بغیر متن کے طبع ہوئے تھے اور ان کے ٹائٹل کور پر جلی خط میں یہ مرقوم ہوتا تھا: ''ترجمہ قرآن مجید بزبان اردو غیر حامل المتن''۔ اور ترجمے کے متن میں ہر آیت کا نمبر بھی مندرج نہیں ہوتا تھا۔

---

[۵۹] ماخذ سابق، ص ۵۷

[۶۰] ماخذ سابق، ص ۵۶

اس کی وجہ سے عام قاری کو آیات کا معنی و مفہوم اچھی طرح سمجھنے میں کچھ دشواری ہوتی رہی ہوگی۔ ترجمہ قرآن بغیر متن کے شائع کیے جانے کی بظاہر کوئی وجہ یا مصلحت سمجھ میں نہیں آتی، خاص طور سے اس صورتِ حال میں کہ فاضل مترجم نے تین مرحلے میں (ڈھائی ڈھائی پارے کے) جزوی تراجم اور آخری پارے کا ترجمہ عربی متن کے ساتھ شائع کرنے کا اہتمام کیا تھا۔ ممکن ہے مکمل ترجمہ قرآن بغیر متن کے اس خیال سے طبع کرایا گیا ہو کہ لوگوں کو استفادہ کے لیے جلد از جلد دستیاب ہو جائے۔ بعض اسکالرز کی رائے یہ ہے کہ مترجم کے ذہن میں یہ خیال رہا ہوگا کہ متن کے ساتھ ترجمے کی اشاعت میں اسے پڑھنے یا اس سے استفادہ میں مصحف کا تقدس اور اس کی عظمت کا پاس و لحاظ رکھنا ہوگا اور اسے پڑھنے یا تلاوت کرنے کے اصول و آداب کی پابندی کرنی پڑے گی، اور بغیر متن کے صرف ترجمے کی اشاعت کی صورت میں ان پابندیوں سے آزاد رہ کر زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے بآسانی استفادہ کر سکیں گے"[61]۔ ٹائٹل کور پر ہی مذکورہ بالا وضاحت (ترجمہ قرآن مجید بزبان اردو غیر حامل المتن) سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ بہر حال عربی متن کے ساتھ ترجمے کی اشاعت سے شائقینِ قرآن کو آیات کے ساتھ ملا کر ان کا ترجمہ پڑھنے میں جو آسانی ہوتی ہے اور فہمِ قرآن کی صلاحیت مزید پروان چڑھتی ہے وہ محتاجِ وضاحت نہیں۔ جدید ایڈیشن (۲۰۲۲ء) میں متنِ قرآن کے ساتھ ترجمے کی اشاعت کا اہتمام بلا شبہ لائقِ تحسین ہے۔ امید کہ آئندہ ایڈیشن میں ترجمے میں بھی ہر آیت کا نمبر درج کرنے کا اہتمام کیا جائے گا، اور اگر رکوع کے نشان اور اس کے نمبر کا بھی اضافہ کر دیا جائے (جیسا کہ جدید دور کے بہت سے اردو تراجم میں ملتا ہے) تو ناچیز کے خیال میں اس سے استفادے میں مزید آسانی ہوگی۔

حقیقت یہ کہ کوئی انسانی کاوش خامی، کمی، غلطی و تسامحات سے مبرّا نہیں ہوتی، البتّہ علمی کاوش کو خوب سے خوب تر بنانے کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ زیرِ تعارف ترجمے میں بھی زبان و بیان اور طرز ادا کے اعتبار سے کچھ خامیاں در آئی ہیں، بعض مقامات پر غیر مانوس یا نامناسب الفاظ، غیر معروف تراکیب کا استعمال اور کچھ آیات کی تشریح و ترجمانی میں مترجم کے تفردات بھی پائے جاتے ہیں۔ بعض آیات کے معنٰی و مفہوم کی وضاحت میں مترجم کا موقف عام مترجمین و مفسرین سے جداگانہ نظر آتا ہے۔ پیشِ نظر مضمون میں ان سب کی تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے کہ اس مضمون سے مقصود محض ترجمے کا تعارفی مطالعہ ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن (علیگڑھ مسلم یونی ورسٹی)

---

[61] علامہ احسان اللہ عباسی کی قرآن فہمی، محولہ بالا، ص ۹۶

سے شائع شدہ مجموعۂ مقالات ''علامہ احسان اللہ عباسی کی قرآن فہمی''میں متعدد مقالہ نگار حضرات نے اس ترجمے کے تجزیاتی مطالعے میں مختلف پہلوؤں سے اس کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ ترجمہ پر تفصیلی مطالعے کے لیے اس مجموعے کی ورق گردانی مفید ہو گی۔

اسی ضمن میں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ اردو ترجمۂ قرآن کے دوران کی تیاری کے لئے مختلف النوع کتب کا مطالعہ کرنے، کئی ایک صبر آزما مراحل سے گذر کر اس کی تکمیل وطباعت میں ایک طویل عرصہ لگادینے کے ساتھ مترجم نے اپنی بے بضاعتی، کم علمی اور ترجمے میں ممکنہ خامیوں اور غلطیوں کا نہ صرف اعتراف کیا ہے، بلکہ قارئین کرام کو بلا جھجھک ان سے واقف کرانے اور اصلاح طلب مقامات کی نشان دہی کی دعوت بھی دی ہے،تاکہ آئندہ ایڈیشن میں انہیں دور کر کے اس ترجمے کو مزید بہتر ومستند بنایا جاسکے۔ان احساسات کی ترجمانی ان الفاظ میں کی گئی ہے: ''میں امید رکھتا ہوں کہ میری غلطیوں کی طرف علمائے دین استادانہ طریقہ سے توجہ کریں گے اور ان سے مجھے مطلع فرمائیں گے تاکہ یہ ترجمہ طبعِ آئندہ میں زائد تر صحیح ہو''[۶۲]۔

مختصر یہ کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ایک قدیم ترین طالب علم کا زیرِ تعارف اردو ترجمۂ قرآن بہت سی امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔اس کا سب سے نمایاں پہلو وہ بلند مقصد (کتابِ ہدایت تک لوگوں کی رسائی اور اس کے پیغام واحکام کو سمجھنے کی راہیں ہموار کرنا) ہے جس کے تحت یہ نیک کاوش کی گئی۔اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ترجمہ کو عام فہم بنانے اور اس سے استفادہ کی راہیں ہموار کرنے میں مترجم نے بھرپور کوشش کی۔ متعدد تفاسیر وتراجمِ قرآن اور دیگر معاون کتب کے گہرے مطالعہ کے بعد ہی انہوں نے ترجمۂ قرآن کی خدمت انجام دی۔آیات کا بامحاورہ ترجمہ کرنے میں فاضل مترجم نے یہ احتیاط برتی ہے کہ ترجمۂ قرآن کے اصل الفاظ کی ترجمانی یا ان کے مرادی معنی کی وضاحت سے بالکلیہ آزاد نہ ہونے پائے۔ ترجمے کے متن کے مشکل الفاظ و نکات کی تشریح، قرآنی اصطلاحات، اعلام، مقامات کی وضاحت اور اشارات و مختصرات کی تبیین کے لیے اس ترجمہ کو حسبِ ضرورت مختصر و طویل حواشی سے بھی آراستہ کیا گیا ہے۔اسی طرح بہت سی آیات کے مفہوم کی وضاحت میں ان کا شانِ نزول بیان کرنے کا اہتمام ملتا ہے۔احکامی آیات سے متعلق حواشی میں فقہی مسائل کی تشریح کے ضمن میں مختلف مسالک کے ائمۂ فقہ کی آراء نقل کرنے کے علاوہ بہت سے مقامات پر اہلِ تشیّع کا موقف بھی

---

[۶۲] دیباچہ ترجمۂ قرآن مجید از مترجم، ص ۵۶

واضح کیا گیا ہے۔ ترجمے میں مختلف مقامات پر قرآنی احکام و تعلیمات پر عمل کے فیوض و برکات اجاگر کرنے کے ساتھ ان کی خلاف ورزی کے برے نتائج سے بھی متنبہ کیا گیا ہے۔ مزید براں ترجمے سے استفادہ پر زور دینے یا اس کی تحریک پیدا کرنے کے ساتھ مترجم نے مختلف پیرایے میں برادرانِ اسلام سے روزمرّہ زندگی میں قرآنی تعلیمات کو دخیل بنانے کی ہمدردانہ اپیل کی ہے، قرآنی احکام و تعلیمات کی روشنی میں لوگوں کو اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے پر ابھارا ہے اور بڑے ہی خیر خواہانہ انداز میں قرآن کی رہنمائی کے مطابق اصلاح احوال کی دعوت دی ہے۔

اردو تحقیق اور اطلاعاتی ٹیکنالوجی

ڈاکٹر محمد یونس ٹھوکر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، کشمیر یونیورسٹی

mohammadyounustaha33@gmail.com

انسان کو روز اول سے ہی کائنات کو مسخر کرنے کی جستجو اور لگن ودیعت کی گئی ہے۔ ہبوط آدم سے لے کر آج تک انسان نت نئے تجربات اور مشاہدات سے انسانی علوم میں اضافہ کرتا آیا ہے۔ گویا تحقیق زندگی کی ہر سطح پر ایک زندہ معاشرے کی اہم اور بنیادی صفت تصور کی جاتی ہے۔ کسی معاشرے میں اگر تحقیق کا عمل رک جائے تو اُس معاشرے میں ہزاروں جھوٹ سچ کا لبادہ اوڑھ کر اسے دیمک کی طرح چاٹتے رہتے ہیں۔ تحقیق کا عمل جس معاشرے میں جتنی سرعت سے جاری رہتا ہے وہ معاشرہ ترقی کے زینے طے کرنے میں اتنا ہی فعال اور متحرک ہوتا ہے۔

لفظ تحقیق ''حق'' سے مشتق ہے جس کے معنی و مفہوم ہیں سچائی یا حقیقت کی تلاش، بازیافت، کھوج یا انکشاف۔ ڈاکٹر تلک سنگھ کے مطابق تحقیق سائنسی اسلوب میں علم کے علاقے کی توسیع کرتا ہے ۔انہوں نے تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: تحقیق علم کا وہ شعبہ ہے جس میں منظم لائحۂ عمل کے تحت سائنسی اسلوب میں نامعلوم و ناموجود حقائق کی کھوج اور معلوم و موجود حقائق کی نئی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ علم کے علاقے کی توسیع ہوتی ہے۔[1]

ڈاکٹر گیان چند جین نے ڈاکٹر تلک سنگھ کی اس تعریف کو پیش کرتے ہوئے تحقیق کے عناصر کا استنباط یوں کیا ہے:

۱۔ نامعلوم کو معلوم کرنا
۲۔ معلوم کی نئی تشریح
۳۔ باضابطہ طریقۂ کار
۴۔ سائنسی اسلوب

---

[1] بحوالہ، ڈاکٹر گیان چند جین، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص ۲۱

۵۔ علم کے علاقے کا پھیلاؤ
۶۔ مواد کی تنقیح
۷۔ مستند نتائج کا استنباط[۲]

یہ تحقیقی عمل ہی ہے جس کی وجہ سے آج ہم اپنی کلاسیکی تصانیف و تحریرات کو ان کی اپنی اصل شکل و صورت میں دیکھ کر ان سے استفادہ اور فیض حاصل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اگر تحقیق نہ ہوتی تو آج سے ہزاروں سال پرانی معلومات، کتابیں، فکر و فلسفہ اور تاریخ ہمارے سامنے صحیح صورت میں دستیاب نہ ہوتیں۔

تحقیقی عمل مرور زمانہ کے ساتھ جامعیت اور ہمہ گیریت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ زمانے کی رو جس قدر ترقی کی جانب گامزن ہوتی ہے اسی قدر تحقیق کے میدان میں درستی اور تیزی آتی ہے۔

آج اکیسویں صدی کی جس دہلیز پر ہم قدم رکھ چکے ہیں، اسے انفارمیشن اور ٹیکنالوجی کی صدی کے طور پر جانا جاتا ہے۔ پوری دنیا آج جس عالمی گاؤں (Global Village) کا منظر نامہ پیش کرتی ہے وہ محض انفارمیشن ٹکنالوجی یا اطلاعاتی ٹکنالوجی کی ہی مرہون منت ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی نے زندگی کے مختلف شعبہ ہائے حیات کے ساتھ ساتھ اردو تحقیق میں بھی ایک قابل دید تبدیلی پیدا کردی ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی نے جہاں فاصلوں کو سمیٹ کر وقت اور دوری کا احساس کم کردیا ہے وہیں معلومات کے ذخائر و خزائن کچھ اس طرح دستیاب کردیے ہیں کہ ہم مختصر اور قلیل مدت میں گھر بیٹھ کر نہایت آرام کے ساتھ اس کا استعمال عمل میں لا سکتے ہیں۔ انگلی کے چند اشاروں پر انفارمیشن ٹکنالوجی نے ایسی معلومات فراہم کی ہیں جن کی حصول کے خاطر انسان کو گھنٹوں یا مہینوں کی قربانی کے ساتھ ساتھ مشقت آمیز سفر اور کثیر اخراجات سے ہوکے گزرنا پڑتا تھا۔ انفارمیشن ٹکنالوجی نے منجملہ تحقیقی میدانوں اور بالخصوص اردو تحقیق کے لیے نئے امکانات کے دریچے وا کیے۔ دیگر زبانوں اور علوم و فنون کی طرح نہ سہی لیکن اردو بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں۔

زیرِ نظر مقالے میں ہم اس حوالے سے درجہ ذیل نکات کی طرف ذہنوں کو مبذول کرائیں: انفارمیشن ٹکنالوجی نے اردو تحقیق میں کس حد تک تبدیلی کے آثار پیدا کیے۔ انفارمیشن

---

[۲] ڈاکٹر گیان چند جین، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص ۲۱

ٹکنالوجی کس حد تک اردو تحقیق میں معاون اور ممد ثابت ہو سکتی ہے۔۔انفارمیشن ٹکنالوجی کی کمیاں اور کوتاہیاں اردو تحقیق کے حوالے سے۔

تحقیقی مراحل میں سب سے اہم اور ناگزیر مرحلہ مواد کی فراہمی اور مواد کی حصولیابی کا ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر عموماً تمام علوم اور بالخصوص اردو ادب کے تعلق سے اطلاعاتی ٹکنالوجی جتنی معاون و ممد ثابت ہو سکتی ہے اس قدر کوئی اور ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس مرحلے پر ہم انفارمیشن ٹکنالوجی کے توسط سے آن لائن وسائل کا سہارا لے کر اپنے تحقیقی عمل میں مواد کی فراہمی کی مشکل کو آسان بنا سکتے ہیں۔

آج انٹرنیٹ پر اردو مواد کے تعلق سے کافی ذخائر دستیاب ہیں۔ بس ان ذخائر تک رسائی کی صحیح آگہی ہونی چاہیے۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہاں پر یہ وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انٹرنیٹ پر مختلف ویب سائٹس پر اردو کے تعلق سے جو کچھ بھی مواد دستیاب ہے وہ صرف اور صرف یونیکوڈ سافٹ وئیر کی بدولت ممکن ہے۔ یونیکوڈ ایک ایسا تحریری نظام ہے جس کو ہر کمپیوٹر اور ہر گیجٹ، ہر سطح پر سمجھ، دیکھ اور لکھ سکے۔ لیکن ان پیج (Inpage) کا معاملہ مائکروسافٹ ورڈ سے مختلف ہے کیونکہ یہ تحریر کی جگہ ایک تصویری ہیئت بناتا ہے۔ ان پیج میں ایک امیج (تصویری) فائل بنتی ہے جو کہ صارفین کی دنیا میں ایک قابل قبول فارمیٹ نہیں ہے۔ اردو اور صارفین کا رشتہ قائم کرانے میں یونیکوڈ اردو کے حق میں ایک رحمت ثابت ہوئی۔ یونیکوڈ ہی وہ واحد وسیلہ ہے جس کی بدولت ہم کسی سرچ انجن میں اپنے مطلوبہ مواد کی تلاش کر سکتے ہیں۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسی کی بدولت ہم انٹرنیٹ پر آسانی کے ساتھ اپنی پسند کی کوئی تحریر محفوظ کر سکتے ہیں۔ ایم۔ ایس۔ ورڈ (MS Word) کے تمام مواد یونیکوڈ ہوتے ہیں۔ یونیکوڈ کی وجہ سے آج انٹرنیٹ اور سوشل نیٹ ورک پر ہمیں اردو کی تحریریں ملتی ہیں۔ یونیکوڈ کی مدد سے زیادہ سے زیادہ مواد تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کو اپنے کمپیوٹر میں پہلے سے ہی متحرک کر کے رکھیں۔ سونے پہ سہاگا یہ ہے کہ اگر ہم اردو فونیٹک کی بورڈ (Phonetic keyboard) بھی پہلے سے ہی اپنے کمپیوٹر میں نصب کر کے متحرک رکھیں تو کسی بھی قسم کا مواد تلاش کرنے میں اور زیادہ آسانی ہو سکتی ہے ۔ واضح رہے کہ یہ دونوں سہولیتیں www.urdu.ca کی ویب سائٹ پر مفت دستیاب ہیں جنہیں وہاں سے ڈاؤن لوڈ کر کے زیر استعمال لایا جا سکتا ہے۔ اردو وکی پیڈیا میں موجود سارا مواد یونیکوڈ ہی کی شکل میں ہے۔ اردو وکی پیڈیا اور یونیکوڈ نے اردو تحقیق میں کس قدر آرام و آسائش کے دریچے وا کیے اس کے متعلق سید مکرم نیازی رقمطراز ہیں:

آج سے دس سال پہلے تک بھی مجھے غالب یا اقبال کے کسی دوسرے مصرعہ کی تلاش ہوتی تھی تو سمندر پار سے کال کر کے والد صاحب سے دریافت کرنا پڑتا تھا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ انکل گوگل (Uncle Google) نہ صرف والد محترم کی جگہ پر آگئے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوا کہ گفتگو کے دوران ادھر والد صاحب نے پوچھا کہ ن۔م۔راشد کے تیسرے مجموعے کا نام ذہن سے محو ہو گیا ہے تو جواباً اردو وکی پیڈیا کی بدولت فوراً سے پیشتر میں نے انہیں مطلع کر دیا۔ در حقیقت انٹرنیٹ پر اردو یونیکوڈ کی ترویج کی بدولت یہ سب ممکن ہوا ہے۔۔۔۔ مختصراً اتنا سمجھئے کی یونیکوڈ کمپیوٹر کا ایک جدید عالمی نظام ہے جس کے ذریعے دنیا کی کوئی بھی زبان تحریر کی صورت میں لکھی اور پڑھی جا سکتی ہے۔[۳]

انفارمیشن ٹیکنالوجی کا صحیح اور بھرپور استعمال عمل میں لا کر ہم اردو تحقیق میں جاذبی، سرعت اور آسانی لا سکتے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی آمد سے پہلے اگر ہمیں تحقیق کے دوران کسی شاعر یا ادیب کے متعلق معمولی معلومات درکار ہوتی تو ہمیں اپنے تحقیقی کام کو روک کر پہلے کسی لائبریری میں جا کر کتابیں کھنگالنے اور مطلوبہ معلومات کو حاصل کرنے کے لیے مشقتیں اُٹھانی پڑتی تھیں، لیکن آج انفارمیشن ٹیکنالوجی کی بدولت معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آج تحقیق کے دوران اگر ہمیں کسی شاعر یا ادیب کے متعلق کسی معلومات کی ضرورت ہو تو اس کے لئے لائبریری جا کر بیاضیں، تاریخیں اور سوانح کھنگالنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہم یونیکوڈ کی بدولت گوگل کے سرچ انجن میں مطلوبہ شاعر یا ادیب کا نام درج کر کے اس کے متعلق دستیاب تمام مواد تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وکی پیڈیا کے ساتھ ساتھ مختلف ویب سائٹس اور بلاگز (blogs) میں اردو شعراء اور ادیبوں کی حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے کلیات، مجموعے، کتابیں، ان پر لکھی گئی کتابیں، اور ان پر کئے گئے تحقیقی کام کی معلومات اور تفصیلات بھی دیکھی جا سکتی ہیں ۔ اردو تحقیق کے ضمن میں انٹرنیٹ پر موجود اردو مواد کے تعلق سے عبدالعزیز سہیل لکھتے ہیں:

انٹرنیٹ پر اردو کی مختلف انجمنوں اور تحقیقی اداروں کی ویب سائٹس موجود ہیں۔ برقیاتی کتابیں بھی کئی ویب سائٹس پر دستیاب ہیں۔ اردو کے اہم رسائل اور اخبارات آن لائن online دستیاب ہیں۔ ساتھ ہی قدیم کتابوں اور رسائل کو چند ادبی انجمنیں اور کتب خانوں کی

---

[۳] محمد عبدالعزیز سہیل، انٹرنیٹ: اردو تحقیق میں مواد کی فراہمی کا جدید ذریعہ، مشمولہ ماہنامہ ''اردو دنیا''، جولائی ۲۰۱۵، ص ۳۳

کتابوں کو ڈیجیٹل کیا جارہا ہے۔ اردو ادب کے اس عظیم ذخیرے کو انٹرنیٹ پر محفوظ کیا جارہا ہے۔ اردو کے شعرا و ادیبوں کی سوانح حیات بھی انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔ اردو وکی پیڈیا، جسے اردو دائرۃ المعارف کہا جاتا ہے، کے ذریعے بھی کافی اہم معلومات انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ اس کو استعمال کرتے ہوئے ہم اپنے موضوع کے لیے مواد کو آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے نہ ہی سفر کرنے کی ضرورت ہے نہ ہی ہزاروں روپیہ صرف کر کے کتابیں خریدنی ہیں۔[۴]

اپنے کمپیوٹر میں اردو یونیکوڈ اور اردو فونیٹک کی بورڈ متحرک کرانے کے ساتھ ساتھ اگر ہم انگریزی گوگل کے توسط سے اردو گوگل صفحہ بھی اپنے ڈیسک ٹاپ پر متحرک رکھیں تو اس سے مواد تلاش کرنے میں مزید آسانی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم اردو گوگل صفحہ پر ''اقبال کی شاعرانہ عظمت'' ٹائپ کر کے سرچ کریں تو اقبال کے متعلق جتنا بھی مواد دستیاب ہوگا، چاہے وہ اقبال کی کتابیں ہوں، ان کے شعری مجموعے ہوں، یا ان پر لکھی گئی کتابیں، ان پر لکھے گئے مضامین، مقالے، بلاگز، ان کے متعلق مزید ویب سائٹس، سب ہی کچھ ہماری اسکرین پر نمودار ہوں گی۔ پھر ہم مطلوبہ مواد پر کلک کر کے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مختلف اداروں اور انجمنوں کی جانب سے ایسی ویب سائٹس بھی فراہم کی گئی ہیں جن پر مختلف موضوعات پر مختلف کتابیں دستیاب ہیں۔ مثلاً قومی کونسل کی ویب سائٹ www.urducouncil.nic.in پر یونیکوڈ کی صورت میں بیسیوں کتابیں نہ صرف دیکھ کر پڑھی جاسکتی ہیں بلکہ اس ویب سائٹ پر بہت ساری کتابیں پی ڈی ایف فارمیٹ (pdf format) میں رکھی گئی ہیں جنہیں مفت میں ڈاؤن لوڈ کر کے تحقیقی کام میں مدد لی جاسکتی ہے۔ نیز اس ویب سائٹ پر اردو رسالہ ''اردو دنیا'' کا ہر شمارہ بھی پی ڈی ایف کی صورت میں دستیاب ہوتا ہے جو کہ مواد کی فراہمی کے تعلق سے اردو تحقیق میں ایک اہم اور مستند ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس ویب سائٹ پر اردو کے ساتھ ساتھ دیگر سائنسی و سماجی علوم پر بھی اہم اور نادر کتابیں موجود ہوتی ہیں۔

یہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ہی دین ہے کہ آج ہم shoudhganga کی ویب سائٹ پر ہندوستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں میں مختلف موضوعات پر کیے گئے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے گھر بیٹھ کر

---

[۴] محمد عبدالعزیز سہیل، انٹرنیٹ: اردو تحقیق میں مواد کی فراہمی کا جدید ذریعہ، مشمولہ ماہنامہ ''اردو دنیا''، جولائی ۲۰۱۵، ص ۳۳

راحت واطمینان کے ساتھ حاصل کر سکتے ہیں۔اس ویب سائٹ پر مختلف یونیورسٹیوں میں تقریباً تمام علوم پر کئے گئے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے پی ڈی ایف فارمیٹ میں دستیاب ہیں۔ بالکل اسی طرح مجلہ خیابان کی ویب سائٹ پر بھی اردو کے تعلق سے اہم اور سنجیدہ مقالے اور مضامین موجود ہیں جو مواد کی فراہمی میں معاون ہو سکتے ہیں۔

دیگر زبانوں کی طرح نہ سہی لیکن اردو زبان وادب نے بھی انفارمیشن ٹیکنالوجی میں ایک مضبوط اور پائیدار جگہ بنالی ہے۔ آج اردو اصناف ادب میں شاید ہی کوئی صنف ہو جس کے متعلق انٹرنیٹ پر مواد و معلومات دستیاب نہ ہوں۔ لہٰذا ایک اردو محقق کو جس موضوع پر بھی کام کرنا مطلوب ہو اس کے لیے انفارمیشن ٹیکنالوجی سے ایک مستحکم رشتہ قائم کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اردو رسائل و جرائد، اخبارات، روزنامے، ہفت روزے اور ماہنامے بھی انٹرنیٹ پر کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اردو دنیا، آجکل، اردو اسکالرز کی دنیا، نیادور، ترسیل وغیرہ جیسے اہم اور معتبر رسالے آج انٹرنیٹ پر پی ڈی ایف کی صورت میں دستیاب ہیں۔ ان رسالوں میں بعض نے اردو کے مشہور شعراء اور ادیبوں کے مخصوص نمبر بھی شائع کیے ہیں جن سے تحقیقی کام میں کافی مدد لی جاسکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انٹرنیٹ پر ایک اردو محقق کو ضرور بزم قلم، قلم قافلہ، گزرگاہ خیال، ادب ڈاٹ کام وغیرہ جیسی اہم پورٹلیں دیکھنی چاہئیں۔ ان پر ہم مفاد عامہ کے لیے اپنے مقالات و مضامین پیش کر سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان پورٹلوں پر پہلے سے ہی مختلف قلم کاروں اور مفکروں کے مقالات و مضامین دستیاب ہیں جن سے استفادہ کر کے تحقیق میں مدد لی جاسکتی ہے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کی بدولت ہم انٹرنیٹ پر مختلف آن لائن کتب خانوں سے بھی مطلوبہ مواد حاصل کر سکتے ہیں ۔ مثلا اردو کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ریختہ کی ویب سائٹ http:/rekhta.org/books پر موجود ہے ۔ اس معلوماتی سائٹ پر شاعری، نثر، لسانیات، تاریخ، تحقیق و تنقید، ترجمہ، عروض وبلاغت وغیرہ کی اہم اور نادر کتابوں کے ساتھ ساتھ نئی اور کلاسیکی کتابیں اور مخطوطے بھی محفوظ ہیں۔ یہ سائٹ ایک اردو محقق کے لیے نہایت ہی کارآمد ہے۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس سائٹ پر موجود کتابیں صرف دیکھی اور پڑھی جاسکتی ہیں انہیں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولیت اس سائٹ میں موجود نہیں ہے۔

www.urdudost.com اردو ادب کے تعلق سے ایک اہم ویب سائٹ ہے جس پر مختلف موضوعات پر مختلف کتابیں پی ڈی ایف فارمیٹ میں دستیاب ہیں جنہیں ڈاؤن لوڈ کر کے زیرِ

استعمال لایا جا سکتا ہے۔ عصر حاضر میں اردو زبان و ادب کو جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے ترقی و ترویج دینے کے لیے ''اردو پوائنٹ ڈاٹ کام'' اور ''بزم اردو لائبریری'' جیسی ویب سائٹس دن دگنی رات چگنی محنت کر رہی ہیں۔ اسی طرح دیگر چند اہم ویب سائٹس جو ایک اردو محقق کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتیں ہیں وہ یہ ہیں: بہار اردو یوتھ فورم، کتابستان ڈاٹ کام، اقبال سائبر لائبریری ڈاٹ نیٹ، اردو محفل لائبریری، صراط مستقیم، ڈیجٹل لائبریری، کتاب گھر، اردو بک لنک وغیرہ۔ ان سب کا انفرادی طور پر تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا مشکل ہے۔[۵]

محققین کی سہولیت کے پیش نظر یہاں پر چند اہم ویب سائٹس کا ذکر کرنا کسی اہمیت سے خالی نہیں۔ ان ویب سائٹس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف ایک یعنی archive.org کی ویب سائٹ پر ایک کروڑ چالیس لاکھ کتب موجود ہیں جن میں انگریزی کتب کی تعداد ا کروڑ ۱۳ لاکھ ۲۹ ہزار ۹ سو ۲۷ ہے۔ عربی کتب کی تعداد ایک لاکھ ۴۲ ہزار ۵ سو ۱۹ ہے۔ اردو کتب کی تعداد ۳۷ ہزار ۶۲ ہے۔ اور فارسی کتب کی تعداد ۱۱ ہزار ۵۸۷ ہے۔

1. www.archive.org
2. www.punjnud.com
3. www.scribd.com
4. www.dli.ernet.in
5. www.books.google.com
6. www.marfat.com
7. www.rekhta.org/ebooks
8. www.maktabah.org
9. www.kitabosunnat.com
10. www.iqbalcyberlibrary.net
11. www.toobaa-elibrary.blogspot.de
12. www.minhajbooks.com
13. www.elmedeen.com
14. www.dawateislami.net/bookslibrary/
15. www.pdfbooksfree.pk
16. www.jamiabinoria.net/ebooks/
17. www.books.ahlesunnat.net/
18. www.ahlehadith.wordpress.com/downloads/urdu-books/
19. www.shiamultimedia.com/urdubooks.html

---

[۵] اس موضوع پر مزید معلومات کے لئے دیکھئے: ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، انٹرنیٹ پر عربی اور اسلامی مآخذ، معارف دسمبر ۲۰۲۱ء ص ۴۵۳۔۴۶۶

20. www.alahazrat.net/book/
21. www.ishaateislam.org/wm/books.html

انٹرنیٹ پر موجود کتابوں کی وجہ سے جہاں ہمارا کافی وقت اور پیسا بچا ہے وہیں تحقیق کے دوران مطلوبہ مواد تلاش کرنے میں نہایت آسانی ہوئی ہے۔ پہلے کتابوں میں مواد، موضوعات، اقتباس اور حوالہ جات تلاش کرنے میں کافی دشواری پیش آتی تھی۔ لیکن اب انفارمیشن ٹیکنالوجی نے اس میں آسانی کے دروازے کھول دیے ہیں۔ آج گوگل یا کسی اور سرچ انجن پر سرچنگ نے اس مشکل کو آسان سے آسان تر کر دیا ہے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی اور اردو کے اس رشتے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو کے حوالے سے جو کام اب تک ہوا ہے وہ قابل تعریف ضرور ہے لیکن تشفی بخش نہیں۔ ابھی اردو کو انٹرنیٹ کی دنیا میں اور آگے لے جانے کے لیے بہت کچھ کرنا باقی ہے:

ابھی تو ناپی ہے مٹھی بھر زمین ہم نے
ابھی تو پورا آسمان باقی ہے

انفارمیشن ٹیکنالوجی کا صحیح استعمال کر کے ہم اردو زبان و ادب اور تحقیق کو ترقی کے اعلی منزلوں کی جانب گامزن کرا سکتے ہیں۔

اخبار علمیہ

رومانیہ میں پتھر اگتے ہیں

جیولوجیکل انسٹی ٹیوٹ، رومانیہ کے ماہرین آثار قدیمہ کو دارالحکومت بخارسٹ سے ۱۰۰ کیلو میٹر مغرب میں کوسٹی اور ریٹی گاؤں میں ''ٹرووانک'' نامی پتھر ملے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق یہ پتھر قدرتی طور پر ارضیاتی عمل کا سبب بنتے ہیں۔ یہ کنکریوں سے شروع ہوتے ہیں اور ہر ہزار سال بعد ۵ سینٹی میٹر بڑھتے ہیں۔ یہ پتھر بنیادی طور پر ریت سے گھرا ہوا ایک ٹھوس پتھر کا حصہ ہوتا ہے جو کرسٹ (بیرونی چھلکا) بناتا ہے اور بارش کے پانی میں موجود معدنیات اس کے اندر ایک تعامل بناتے ہیں جس سے اندر کا دباؤ بڑھ جاتا ہے جس سے چٹانیں بڑھ جاتی ہیں۔ یہ ان حلقوں سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے جو درختوں سے گھرے رہتے ہیں۔ (صحیفۃ الوطن، بحرین ۴ جون ۲۰۲۳ء ص ۲۰)

تین ہزار برس قدیم راک (چٹانی) پینٹنگ کی دریافت

شمال مغربی چین کے صوبہ شنگھائی میں دریائے ٹونگٹیان کے تین مقامات پر تین ہزار سال پرانی چٹانی تصویریں دریافت ہوئی ہیں۔ چینی سنگھوا ایجنسی نے تحقیقاتی ٹیم کے سربراہ جمیانگ نیما کے حوالہ سے بتایا کہ زیادہ تر پینٹنگ جانوروں کی سادہ ڈرائنگ ہیں۔ جیسا کہ ایک جنگلی بیل کی خوب صورت پینٹنگ کی دریافت سے معلوم ہوتا ہے جس کی اونچائی ۱۸ اور چوڑائی ۲۱ سینٹی میٹر ہے۔ اس قسم کے چٹانی آرٹ کے نمونے نہر ٹونگٹیان کے وسطی علاقوں میں بہت زیادہ بکھرے ہیں۔ رشیا ٹوڈے کے مطابق تحقیقی ٹیم کے سربراہ کا کہنا ہے کہ اس علاقہ میں دریافت ہونے والی پینٹنگز کی تعداد ۵۹ ہے۔ جن میں سے ۳۶ پینل (تختیاں) ۳۸۰۰ میٹر سے زیادہ بلندی پر ہیں۔ انسان کے علاوہ ان پینلوں پر مختلف جانوروں جیسے جنگلی بیل، ہرن، بھیڑیے، شیر، کتے، گھوڑے اور اونٹوں کی ڈرائنگ دیکھی جاسکتی ہے۔ سائنس دانوں کا بیان ہے کہ اس دریافت سے دریائے یانگتسی کے چشموں کے علاقوں میں آباد قدیم اقوام کی ثقافت کے متعلق اہم معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ (صحیفۃ الوطن، بحرین ۱۹ ذی الحجہ ۱۴۴۴ھ ۱۷ جون ۲۰۲۳ء ص ۱۶)۔

ک، ص اصلاحی

تبصرہ کتب

امیر شریعت، حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ- حیات و خدمات: مرتب مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانوی، معاون مرتب مولانا ڈاکٹر وارث مظہری قاسمی، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش صفحات: ۶۲۴۔ ملنے کا پتہ: دارالاشاعت خانقاہ رحمانی مونگیر (بہار)۔ قیمت: ۴۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۸ء۔ موبائل و ایمیل: درج نہیں

امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مولانا محمد علی مونگیری کے خلف الرشید اور مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادی کے مرید تھے۔ ان کا شمار برصغیر پاک وہند کے ممتاز ترین علما، مجاہدین آزادی، قومی وملی قائدین اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ دینی حمیت، بلند حوصلگی، ملی غیرت، دور اندیشی، عاقبت بینی، فقہی وسیاسی بصیرت، عزیمت، مردم گری، فکری بالیدگی، قائدانہ صلاحیت، عالمانہ لیاقت، حق گوئی وبے باکی تصنیفی وتالیفی ہنر مندی جیسے عناصر سے ان کی شخصیت مرکب تھی۔ وہ اختیار کردہ موقف پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام اور یونیفارم سیول کوڈ کے خلاف کامیاب احتجاج کے پس پشت ان کے اسی مزاج کا دخل تھا۔ ان کے علمی، تعلیمی، روحانی، ملی اور قومی کارناموں سے ایک جہاں متاثر ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی شناخت اور ثقافتی ودینی ماحول ومزاج کے تحفظ اور فرقہ واریت کی مخالفت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ ملی جذبات واحساسات کی صحیح اور بروقت ترجمانی اپنے وقت میں جس انداز سے انہوں نے کی ویسی شاید ہی کسی نے کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی اہم دینی درسگاہوں اور تنظیموں کے معزز رکن بنائے گئے۔ ان کے حالات اور ان کے مدبرانہ افکار یقیناً اس لائق ہیں کہ ان کو ملک وملت کے سامنے بار بار پیش کیا جائے۔ ان کا باریک بینی سے مطالعہ وتجزیہ اور ان سے استفادہ کیا جائے۔

اسی احساس کے تحت ۲۰۰۵ء میں دہلی میں ان کی شخصیت اور ان کے کمالات کے تجزیہ وتعارف کے مقصد سے ایک سیمینار منعقد کیا گیا یہ اسی سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ پندرہ برس بعد اشاعت اور معارف میں تبصرہ کی نوبت اب آئی ہے۔ مرتب جوار رحمت میں چلے گئے اور اس کی طباعت نہ دیکھ سکے۔

اس مجموعہ سے قبل بھی مولانا کی زندگی پر کئی اہم اور ضخیم کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے اہم اور لائق مطالعہ ہے کہ اس میں ملک کے نام ور اور ممتاز ترین اہل قلم نے مقالات لکھے ہیں اور مولانا کی شخصیت کے کمالات اور علمی، تصنیفی، قومی اور ملی کارہائے نمایاں کے تقریباً تمام پہلوؤں

کااحاطہ وتجزیہ کیا گیا ہے۔پیش لفظ، مقدمہ اورپیغامات کے بعد مقالات کوچار ابواب حیات و شخصیت،افکار وخیالات، خدمات اور کارنامے، نقوش وتاثرات میں تقسیم کرکے پورے مواد کو مرتب کیا گیاہے۔ البتہ بیشتر مقالات تاثراتی نوعیت کے ہیں۔حوالوں کے اہتمام کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے۔مقدمہ نگار کا یہ احساس بھی بجاہے کہ ان کے مجوزہ خاکہ کے مطابق مقالات موصول نہ ہونے کے سبب بہت سی باتیں، واقعات اور تبصرے مکرر ہوگئے ہیں۔(ص۱۸)(کلیم صفات اصلاحی)

مشاہیر شعروادب: پروفیسر محسن عثمانی، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گردپوش، صفحات ۲۷۴، ملنے کا پتہ: قاضی پبلیکیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹر،بی-۳۵نظام الدین (ویسٹ) نئی دہلی۱۱۰۰۲۵ ۔ قیمت: ۲۹۵روپے۔ سنِ طباعت۲۰۱۸ء۔ موبائل نمبر: درج نہیں۔ای میل:qazipublishers@yahoo.com

اردو زبان و ادب کی تاریخ اور مشہور شعرا وادبا کے مختصر اردو تذکروں کی کمی نہیں ہے۔ایسے میں زیر تبصرہ تذکرہ کی کیاضرورت تھی؟ یہ سؤال اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کی نسبت ہندوستان کے مشہور اور ایسے صاحب طرز ادیب کی طرف ہے جس نےاسی دشت کی سیاحی میں ایک عمر کھپادی ہےاور تقریباًدودرجن کتابیں ان کے نوک قلم سے نکلی ہیں جن میں قابل ذکر تعداد کا تعلق صنف ادب سے ہی ہے۔عام طور پر اس قسم کے مختصر تذکرے طالب علموں کو فکری غذافراہم کرنے اور شائقین ادب کی معلومات میں اضافہ کے مقصد سے تیار کیے جاتے ہیں۔ مصنف نے مقدمہ میں اس کے ساتھ اس کادوسرا مقصد یہ بھی بتایاہے کہ اس سے نظر میں وسعت پیدا ہوگی اور مزید مطالعہ کے لیے یہ تذکرہ مہمیز کاکام کرے گا(ص ۱۰)۔اس تذکرہ کی خاص بات یہ ہے کہ یہ بہ یک وقت اردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں کے کل ۱۸۲ مشاہیر شعروادب سے واقفیت بہم پہنچاتاہے۔

تذکرہ کوچھ ابواب میں منقسم کرکے ہر باب کے شروع میں ایک ڈیڑھ صفحہ میں موضوع کاتعارف کرایا گیاہے۔اس کے بعد متعلقہ زبانوں کے شعرا وادبا کے حالات اور شعری ونثری نمونے تحریر کیے گئے ہیں۔ لیکن ادبا کے اقتباسات یانثری نمونے نہ کے برابر ہیں۔ بیشتر عرب شعرا کے تذکرہ میں عربی اشعار مع ترجمہ نقل کیے گئے ہیں لیکن بعض کے محض ترجمے دیے گئے ہیں۔یہی صورت حال کم و بیش فارسی شعرا کے تذکرہ میں بھی ہے۔ صاحب کتاب کو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے جس کا اندازہ اس تذکرہ سے کیا جا سکتا ہے۔صاف، شگفتہ اور معیاری اردو لکھتے ہیں۔ان کے اس اسلوب اور اعلی ادبی ذوق کاایک حلقہ معترف بھی ہے۔نقد کا انداز بھی نرالا اور متین ہے۔البتہ تصحیح کی جانب خاص توجہ ضروری تھی۔ بعض زبان زد اور مشہور مصرعے اور اشعار غلط چھپ

گئے ہیں۔ مثلاً ص ۱۴۱ پر ہائے اس زود کا پشیماں کا پشیماں ہونا۔ یہاں "کا" زاید ہے۔ ص ۵۳ پر اب دیکھئے ہے ٹھہرتی جا کر نظر کہاں۔ اس مصرعے میں "دیکھئے" کی جگہ "ٹھہرتی" اور "ٹھہرتی" کی جگہ "دیکھئے" چھپ گیا ہے۔ ص ۱۳۷ پر قصیدہ بردہ کا مشہور شعر اس طرح لکھا ہوا ہے۔ بانت سعاد فقلب (فقلبی) الیوم مبتول (متبول) متیم اثرھا لم یفدی (یفد) مقبول (مکبول)۔ ناظرین ان فاش غلطیوں کا اندازہ خود کر سکتے ہیں۔ قوسین میں صحیح الفاظ درج کر دیے گئے ہیں۔ لیکن اس طرح کی طباعتی غلطیوں سے مصنف کی ادبی عظمت متاثر نہیں ہو گی۔ (ک۔ ص۔ اصلاحی)

رباعیات کندن (رودکی، سحر عشق آبادی، وزار علامی کے آہنگوں میں): کندن لال کندن، مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۱۶۰۔ ملنے کا پتہ: مصنف و مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ قیمت: ۲۵۰ روپے سن طباعت: ۲۰۱۸ء موبائل نمبر ۹۲۱۱۰۰۰۱۴۰۔ ای میل: درج نہیں۔

فن عروض و رباعیات کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ ان میں درک و دسترس اور کمال حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میدان کے مرد میداں بہت کم نظر آتے ہیں۔ جو اس وادی خار زار میں قدم رکھتے بھی ہیں تو آبلہ پائی کے ڈر سے جلد ہی واپس چلے آتے ہیں۔ لیکن مصنف ایسے بے جگرے ہیں کہ ان کے شوق جنوں نے اس سے نبرد آزمائی ہی میں لطف محسوس کیا اور فن عروض، ارمغان عروض، عروض پنگل و خلیل فن عروض میں اور رباعیات اختر، چوں آہنگوں پر مشتمل رباعیات کندن، چوں آہنگوں پر مشتمل رباعیات کندن برزبان ہندی اور رباعیات و ماہیے اور ماہیے کی ہیئت وغیرہ جیسی کتابیں لکھ کر اپنی مشق و ممارست کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اردو رباعیات نگاری میں اس وقت ان کے بالمقابل کم ہی شعرا ٹک پائیں گے۔

رباعی کوزہ میں سمندر ہے۔ بڑے سے بڑا اخلاقی نکتہ اور دقیق سے دقیق مسئلہ چار مصرعوں میں پورا ہو جاتا ہے۔ مصنف نے اس مسئلہ پر قابو پانے کی دانستہ کوشش کی ہے۔ روایتی اور جدید اوزان پر بھی ان کو دسترس ہے۔ عراق رضا زیدی کے مطابق انہوں نے اوزان کو سمجھنے میں بڑی محنت کی ہے۔ نئی کاوشوں کی جستجو کی ہے اور رباعی کے اوزان کی مزید بحروں میں تقطیع کی ہے لیکن اوزان میں "سبب پئے سبب اور وتد پئے وتد" کا وہ اصول توڑ دیا گیا ہے جو رباعی کے آہنگ کو جلا بخشتا ہے (ص ۷)۔ سلاست و برجستگی کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ البتہ ہر رباعی کے نیچے وزن دینا انتہائی پتہ ماری کا کام تھا، مصنف نے اس مشکل کو بہ حسن و خوبی حل کیا ہے۔ امید ہے دوسری ادبی تصنیفات کی طرح اس کو بھی قبولیت ملے گی۔ (ک۔ ص۔ اصلاحی)

قاری علیم الدین قاسمی: حیات و خدمات: شریف احسن مظہری، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۱۲۸۔ ملنے کا پتہ: تاج بک ڈپو، اقرا مسجد مین روڈ، رانچی۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۸ء موبائل نمبر ۹۶۰۸۰۶۶۰۸۶۔ ای میل: درج نہیں۔

مولانا قاری علیم الدین قاسمیؒ کی پیدائش ریاست جھارکھنڈ کے ایسے علاقہ میں ہوئی جو علمی، دینی، معاشی، سماجی اور ثقافتی لحاظ سے پسماندہ تھا۔ ناظرہ اور ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے انہوں نے مئو، فتح پوری اور دیوبند کا سفر کیا۔ دیوبند میں مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابراہیم بلیاویؒ اور مولانا قاری طیبؒ صاحب جیسے اکابر علما سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ واپس آکر اپنے علاقہ کی علمی، دینی اور روحانی ترقی اور سماجی و ثقافتی صورت حال کی اصلاح و درستگی کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ اپنے اخلاص، وفا اور سعی پیہم کے سبب وہاں کی مقبول ترین شخصیت اور مرجع خلائق بن گئے۔

زیر نظر کتاب میں ان کی حیات و خدمات کی تفصیلات کے لیے آٹھ جلی عناوین قائم کیے گئے ہیں۔ جھارکھنڈ کی مقبول ترین شخصیت، قاری صاحب کے عہد طفولیت میں علاقہ کی صورت حال، مدارس و مساجد کا قیام، قومی و ملی سرگرمیاں، قاری صاحب گھر کے اندر گھر کے باہر، قاری صاحب کے یاران رفتگاں، کچھ قریبی رفقا، احساسات و جذبات اور آخر میں ان کی وفات پر بعض اہل علم کے تاثرت کے تحت قاری صاحب کی ملی، قومی اور مجاہدانہ زندگی کے بیشتر پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مولانا کا سب سے عظیم الشان کارنامہ مدرسہ محمودیہ کا قیام اور مدینہ مسجد کی تعمیر ہے۔ مولانا کو ملی، قومی اور سیاسی سرگرمیوں کی انجام دہی میں جن رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور مولانا نے ان کا جس خوش اسلوبی سے سامنا کیا اور خود مولانا کی طرف سے جو ردعمل رہا ان کی جانب حسب موقع اشارے بھی کیے گئے ہیں۔

مصنف کو مولانا سے رشتۂ مصاہرت اور تقریباً چالیس سالہ صحبت و قربت حاصل ہے لیکن حالات کے جامع ذکر میں انہوں نے تاریخی و علمی دیانت کا لحاظ کیا ہے۔ مدح و قدح دونوں پہلو پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ ان کا خود بیان ہے کہ کوئی بھی بات نہ خلاف حقیقت ہے، نہ ہی کسی طرح کی مبالغہ آرائی کا دخل ہے (ص ۶)۔ مصنف کوئی مشاق اہل قلم نہیں ہیں لیکن اسلوب میں جامعیت، بیان میں پختگی اور متانت نمایاں ہے۔ زبان صاف و سلیس ہے۔ کتاب میں جہاں کہیں نقد و جرح کے مواقع آئے ہیں اپنے ادبی ذوق سے کرختگی بہت حد تک کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب لائق مطالعہ ہے۔

ک، ص اصلاحی

نام کتاب: ابجد عشق، شاعر: مرزا اطہر ضیاء، صفحات: ۱۶۰، ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۰۰ روپیے۔ زیر اہتمام: انجمن محبانِ اردو ہند، دوحہ قطر۔

مدرستہ الاصلاح کے فارغین کی ادبی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اطہر ضیاء مرحوم اسی ادارے کے پروردہ تھے۔ اس جوانِ رعنا کو نہ جانے کس کی نظر بد لگ گئی کہ وہ بہت جلد ایک مہلک بیماری کا شکار ہو گئے اور چند سال قبل داغِ مفارقت دے گئے۔

مرحوم کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ فطری شاعر تھے۔ کئی معاصرین نے ان کی شاعری کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بجا لکھا ہے:

> ایک وہ جو پڑھ لکھ کر قابلیت کے زور سے شاعر بنتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہو کر آتے ہیں، وہ کچھ بھی نہ پڑھتے تو بھی شاعر ہی ہوتے ہیں، پہلے لوگ بہ تکلف شاعر بنتے ہیں اور دوسرے فطری شاعر ہیں۔ البتہ تعلیم ان کی شاعری کو جلا دیتی ہے۔ (کلیات سہیل، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ، ۲۰۱۱ء، ص ۷)

مرحوم اطہر ضیاء بھی اسی قبیل کے شاعر تھے۔ ان کے مجموعۂ کلام "ابجد عشق" کے جائزے سے بھی یہی انداز ہوتا ہے کہ وہ ایک فطری اور وہبی شاعر تھے۔ ان کی زندہ شاعری اپنے دامن میں جس طرح کے بلند خیالات اور پاکیزہ جذبات کو سمیٹے ہوئے ہے، وہ ان ہی کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ اتنی کم عمری میں اس قدر پختہ شاعری ایک کہنہ مشق شاعر ہی کر سکتا ہے۔

اطہر ضیاء کی شاعری ان کے نام کی طرح ضیاء بار اور پاکیزہ ذوق کی حامل معلوم ہوتی ہے، اور یہ پاکیزہ خیالات کی خوشبو "ابجد عشق" کے ہر ورق سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً: مرحوم ایک جگہ دنیا کو امن کا گہوارہ اور جنت بنانے کے متمنی اور پھر نقل مکانی کی خواہش کرتے ہیں۔ اس خیال کو کس قدر پاکیزگی سے ادا کرتے ہیں:

جب بنالوں تری دنیا کو میں جنت یارب
تب مجھے نقل مکانی کی اجازت دی جائے

اس دنیا میں جینے کے لیے قیس وفرہاد کا جگر چاہیے۔ اطہر ضیاء مرحوم اپنے تجربات کو یوں نقل کر رہے ہیں:

زندگی پاس مرے بیٹھ کبھی تجھ سے کرنی ہیں ضروری باتیں
یہ جو ہریالی خدوخال میں ہے زہر نس نس میں اتارا ہے میاں
کبھی میں قیس ہوں اطہر تو ہوں کبھی فرہاد مرا ہی ذکر ہے دنیا کی سب کتھاؤں میں

ایک جگہ مرزا اپنی شاعری کے بارے میں بڑے پر اعتماد لہجے میں کہتے ہیں:

بہت سی آنکھیں مری راہ دیکھتی ہوں گی
میں ایک خواب ہوں، تعبیر ہو رہا ہوں ابھی

تملق اور خوشامد پسندی ہمیشہ ایک معاشرتی واخلاقی کمزوری رہی ہے۔ مرحوم اس بات کو کس خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں:

ضرور مجھ سے کوئی کام پڑ گیا ہے اس کو
وہ پڑھ رہا ہے بہت آج کل قصیدے مرے

ایسے ہی ان کی غزلوں میں بعض ایسے خوب صورت اشعار ہیں، جو عصری معنویت کے بھرپور ترجمانی کرتے ہیں:

نمازیں تو بہت ہی مختصر ہیں مگر لمبی دعائیں مانگتے ہیں
رگڑنے کو زمیں پر ناک اپنی یہاں کچھ لوگ سجدہ کر رہے ہیں

مرزا مرحوم ان باحوصلہ لوگوں میں تھے، جو اپنی دنیا آپ بناتے ہیں:

میں خود سے عشق بہت بے تحاشا کرتا ہوں سمجھ رہی ہے یہ دنیا تماشا کرتا ہوں
ہنر کی شاخوں پہ آتی ہے اس سے ہریالی سو گاہے گاہے میں خود کو تراشا کرتا ہوں
نہ اختلاف ہے کوئی نہ برہمی ہوئی ہے مگر خلوص میں تھوڑی بہت کمی ہوئی ہے
دیکھ لگ جائے تکبر کی نہ دیمک تجھ کو یہ وہ کیڑا ہے، جو کردار کو کھا جاتا ہے
اب کسی شخص کو بھی چڑھاتا نہیں سر پہ جو چڑھتا ہے دستار کو کھا جاتا ہے
ہزار راتوں پہ پھیلی ہے داستاں مری یہ دل کی بات ہے اور اتنی مختصر نہیں

☆

اس مجموعے میں غزلوں کا حصہ کسی قدر طویل ہے۔ اس کے علاوہ متفرقات میں مطلع اور ایک شعر، اور متفرق اشعار جیسے بعض عناوین شامل ہیں۔ (فضل الرحمن اصلاحی)

ادبیات

غزل

طارق غازی (وھٹبی، کینیڈا)

m.tariqghazi@gmail.com

اک دشت بے مراد ہے اور غم کی رات ہے
موہوم ہر سراب میں خواب نجات ہے

اس تکنکہ[1] میں تنکہ سے زیادہ نہیں ہیں لوگ
تہذیب نو میں کم عملی کو ثبات ہے

پوشیدہ اپنے وہم کے پیراہنوں میں دیکھ
ہر آستین میں وہی لات و منات ہے

اک شاہراہ درد پہ کتنے پڑاؤ ہیں
کلیر ہے، قونیہ ہے، حلب ہے، ہرات ہے

اشیاء طواف عرش میں مشغول ہیں مدام
طبعی شریعتوں پہ رواں کائنات ہے

اجرام گھومتے ہیں سدا مرکزوں کے گرد
گردش کا یہ دوام ہی ان کی صلاۃ ہے

ان سے ہوا فکاں کی حقیقت کا راز فاش
ہر ذرہ کے وجود میں اک کائنات ہے

خوارزمی بس خیال ہے، رازی بس ایک خواب
جز بیں کمال منتظر التفات ہے

ہر بیج میں شجر کا مکمل وجود ہے
ہر پھول میں بہار کا رمز وفات ہے

پڑھتا ہے کون آج گلستان و بوستاں
وہ ذکر عقل کا ہے، محبت کی بات ہے

نمرود کے زمانہ سے پیاسا ہے ریگزار
اشکوں کی دھار شہر میں نہر فرات ہے

اک ذہن جس کے فکر کی وسعت ورائے فکر
اک آنکھ جس کی دید ورائے جہات ہے

طارق ،سفر ہے سوچ کے صحرا میں آج پھر
اس دشت فکر میں نئی عمرانیات ہے

---

[1] تکنکہ: ٹیکنولوجی، تکنیکیات

وہ راستہ جس پر لوگ نہیں چلے

رابرٹ فراسٹ ۔ ترجمہ: ڈاکٹر ظفرالاسلام خان

ایک پیلے جنگل میں دو راستے الگ ہوئے
مجھے افسوس ہے کہ میں دونوں پر نہیں چل سکتا تھا
کیونکہ میں ایک اکیلا مسافر تھا
میں دیر تک کھڑا رہا اور جہاں تک دیکھ سکتا تھا، دیکھتا رہا
وہاں تک جہاں سے وہ دونوں راستے مڑ کر الگ ہو گئے
پھر میں نے دوسرا راستہ پکڑ لیا
وہ بھی پہلے راستے کی طرح خوبصورت تھا
لیکن شاید وہ زیادہ حقدار تھا
کیوں کہ اس میں بہت گھاس اگی ہوئی تھی
جس کو دبانے کی ضرورت تھی
جو لوگ اس راستے سے پہلے گزر چکے تھے
انہوں نے بھی اس گھاس کو دبایا تھا
اس صبح وہ دونوں راستے میرے سامنے کھلے تھے
ان پر پتیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر کوئی چلا نہیں تھا
میں نے ان دونوں میں سے ایک راستے کو کسی دوسرے دن کے لئے چھوڑ دیا
حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ ایک راستے سے دوسرا راستہ نکلتا ہے
اور مجھے شک تھا کہ میں کبھی بھی واپس نہ آپاؤں گا
آج میں ایک آہ کے ساتھ کہتا ہوں
صدیوں پہلے جنگل میں دو راستے بنے تھے
اور میں نے وہ راستہ اپنایا جس پر کم لوگ چلے تھے
میری زندگی میں سارا فرق اسی فیصلے کا تھا[1]

---

[1] یہ امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ Robert Frost (۱۸۷۴–۱۹۶۳) کی انگریزی نظم The Road Not Taken کا ترجمہ ہے (ظ۔ا۔خ)۔

معارف کی ڈاک

معارف جون ۲۰۲۳

سارے مضامین دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ ہر شمارے میں (کبھی ناغہ بھی ہو سکتا ہے) اگر ایک مضمون بک ریویو کی مناسبت سے ہو تو یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔ کتابوں پہ یہ مختصر تبصرے بے شک نہ بھی ہوں اور اس کی جگہ چار چار سطروں میں مختصر تعارف آجائے تو اس سے مقصد پورا ہو جائے گا۔

دراصل کتب میں چھپنے والے خیر کو نمایاں کرنا اور شر کو بے نقاب کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ کتب اردو، انگریزی اور ہندی کی منتخب کر کے مختلف افراد کے سپرد کی جائیں۔ ورنہ یہ بھی ہے کہ سال میں کم از کم دو شمارے ایسے تفصیلی بک ریویوز پر مشتمل ہوں۔

سلیم خالد (ایڈیٹر ترجمان القرآن)، لاہور
ubm@gmail.com

(۲)

معارف کا جون ۲۰۲۳ء کا شمارہ کافی معلوماتی ہے۔ اس میں ڈاکٹر محمد شمیم قاسمی صاحب کا تحقیقی مقالہ جو کہ شاہ عبدالعزیزؒ کے حالات کا جائزہ ہے، بہت پسند آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت تحقیق سے مقالہ تیار کیا ہے، دونوں حضرات مبارک باد کے مستحق ہیں۔

۲۔ صفحہ ۱۹ پر چاروں اماموں کے بارے میں ذکر ہے، اس میں امام مالکؒ کے احوال کے بعد دوبارہ امام مالکؒ لکھا ہے جو شاید کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے، وضاحت طلب ہے۔

۳۔ اس مقالے میں شاہ عبدالعزیزؒ کی تصانیف کے بارے میں لکھا ہے، مجھے ان میں سے تین کتابیں چاہئیں۔ کیا ان کتابوں کے اردو ترجمہ والی آپ کے ادارے میں مل سکتی ہیں، اگر نہیں تو کہاں سے دستیاب ہوں گی، براہ کرم اس کا نام و پتہ ارسال کریں، عین نوازش ہوگی:

۱۔ تحفہ اثنا عشریہ

۲۔ سر الشہادتین ۳۔ ملفوظات عزیزی

ایس. ایم. خان، میرٹھ
mkmskhan@gmail.com

(۳)

ملک میں ادبی رسالے بہت ہیں لیکن معارف جیسا علمی اور دینی رسالہ نہیں۔اس لیے خالص ادب پر طویل مضامین کی اشاعت معارف کی توہین ہے۔اقبال کا کلام تو قرآنی فکر ہی ہے۔لیکن آپ کے رکن ادارت نے ایں خادم الحروف کی تالیفِ ''کلام اقبال : موضوعاتی ترتیب'' پر تبصرے سے یہ فرما کر انکار کر دیا کہ اس کا سنہ اشاعت پرانا ہے۔یوں خود اقبال کی توہین کی گئی ہے ! قدیم قدر دان کی اس طرح ناقدری اچھی بات نہیں۔

میں نے ۱۹۶۳ء میں نلگنڈا میں معارف کے ۵ شماروں کی ایجنسی لے رکھی تھی جو کئی سال چلتی رہی۔ خریدار نہ ہونے پر بند کر دیا لیکن انفرادی خریداری جاری رکھا۔ لیکن مذکورہ حادثے کے بعد اب دل شکستہ ہو گیا ہوں۔اس لیے گزارش کرتا ہوں کہ رسالہ بند کر دیں۔ہاں زر سالانہ انشاء اللہ تادمِ اخیر روانہ کرتا رہوں گا۔

ادب برائے ادب اور دنیا برائے دنیا کا زمانہ گیا۔ اب تو ادب برائے زندگی اور دنیا برائے آخرت کی بات ہونی چاہئے۔ خدا اور رسول تو دنیا و آخرت کی بات کریں اور ہمارے واعظین و علما دین و دنیا کی بات کرتے ہیں۔اب عوام و خواص کے کان لفظ آخرت سے ناآشنا ہو گئے ہیں۔ ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئے !

معارف کی طرف سے محترم و معزز خریداران سے گزارش ہے کہ اگر وہ خوش حال ہیں تو معارف کے لائف ممبر بن جائیں۔اگر ان کے جانشین معارف پسند نہیں کرتے ہیں تو آپ خود ہی اپنے علاقے کے کسی دینی ادارے کا نام و پتہ لکھ بھیجیں تو رسالہ ان کے نام روانہ کیا جاتا رہے گا۔ آپ کی طرف سے حصول ثواب کی یہ معقول صورت ہے۔

ایس ابو العلا ابن غوری

حیدرآباد (تلنگانہ)

saibneghouri@gmail.com

رسید کتب موصولہ

انبیائے کرام سیریز۔(۱۲ کتابیں)، سچی کہانیاں سیریز ۱، ۲ (۔۱۵،۱۵ کتابیں)، ایمانی کہانیاں سیریز (۵ کتابیں)، عبادات سیریز (۵ کتابیں): محمد عارف اصلاحی، نعمت فاؤنڈیشن، نعمت نگر سرائے میر، اعظم گڑھ، سال اشاعت: ۲۰۲۲ء، قیمت بالترتیب ۲۴۰، ۳۰۰، ۳۰۰، ۱۰۰، ۱۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۸۹۴۲۶۳۶۳

بنگال میں اردو افسانہ آغاز تا حال (جلد سوم): محمد عمران قریشی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، صفحات ۲۸۰، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۲۱۱۴۴۴۰۔

تذکرۃ القراء: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، سالم بک ڈپو تکیہ اعظم گڑھ۔ صفحات ۲۱۶، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۱۹۵۳۴۴۴۷۔

حضرت شاہ نجم الدین قلندر: مؤلف مختار احمد خاں، برکاتی کتب خانہ، بزریا، بڑوالی چوکی مین روڈ، اندور (ایم.پی)، صفحات ۱۹۲، سال اشاعت ۲۰۱۵ء، قیمت ۱۵۱ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۲۷۰۸۳۷۲۰۔

خوشۂ آرزو: مولانا محمد اویس قاسمی، قاسمی لائبریری، بڑہل گنج، ضلع اعظم گڑھ، صفحات ۹۰، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۱۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۳۳۵۳۵۶۱۷۷۔

رسالہ ''ادب'' (تحقیق انتخاب اور اشاریہ): جاوید اختر علی آبادی، دانش محل، امین آباد، لکھنؤ، صفحات ۴۰۵، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۷۱۷۵۸۱۶۶۶

شیخ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی، حیات و مکتوبات: محمد عرفات اعجاز اعظمی، مکتبہ ضیاء الکتب محلہ اترار ی خیر آباد، ضلع : مئو، صفحات ۱۸۴، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۲۳۵۳۲۷۵۷۶

ظفر اوگانوی پیچ کا ورق کے تناظر میں: دبیر احمد مدیحہ پبلی کیشنز کولکاتا، صفحات ۳۴۴، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۴۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۳۳۰۷۸۸۰۲۔

مٹھی بھر خطوط (میرے نام): ڈاکٹر شکیل احمد، مکتبہ الفہیم، صدر چوک، دھوبیا ملی روڈ، مئو ناتھ بھنجن (یوپی)، صفحات ۲۴۰، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۲۳۶۷۲۲۵۷۰۔

مظفر حنفی کے تبصرے: فیروز مظفر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، صفحات: ۲۰۸، سال اشاعت ۲۰۲۳ء قیمت ۳۰۰ روپے موبائل نمبر: ۹۳۱۰۳۶۵۳۷۳

مضمون نگاروں کے لئے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۵ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یا ڈاک سے بھیجا جارہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبر وار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ، صفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین و مقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھالیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

۱۱۔ ہر مقالے کے ساتھ یہ وضاحت ہو کہ یہ مقالہ پہلے کہیں نہیں چھپا ہے اور اسے چھپنے کے لئے کہیں اور نہیں بھیجا جارہا ہے۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	300/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	400/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم (اول)	250/-
شعر العجم (دوم)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-
شعر العجم (چہارم)	200/-
شعر العجم (پنجم)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
خطبات شبلی	150/-
موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات فارسی (فارسی)	--
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-
انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma’arif (Urdu) Print **AUG 2023** Vol. 210/08

RNI No. 13667/57 MA’ARIF AZM/NP-43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	” ”	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	” ”	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	” ”	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	375/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	” ”	500/-
تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندویؒ	400/-
تاریخ صقلیہ دوم	” ”	400/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	375/-